مارچ - اپریل
۱۹۶۴ء

ماہنامہ

میثاق

لاہور

زیر ادارت

امین احسن اصلاحی

قیمت فی پرچہ ساٹھ پیسے۔
سالانہ چھ روپے (پندرہ شلنگ

جلد (۱۰) ذیقعد و ذوالحجہ ۱۳۸۳ھ شمارہ (۳و۴)

ماہنامہ میثاق لاہور

فہرست مضامین

- تذکرہ و تبصرہ — امین احسن اصلاحی — ۲
- تدبر قرآن تفسیر سورۂ بقرہ — امین احسن اصلاحی — ۹
- افاداتِ فراہیؒ "وحی کی حقیقت" خالد مسعود صاحب — ۴۱
- اقتباسات و تراجم
  "دورِ حاضر میں تنظیم اجتہاد کی ایک اسکیم" خالد مسعود صاحب — ۵۲
- بحث و نظر "پاکستان میں خاندانی منصوبہ بندی اور مذہب"
  جناب ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب ڈائریکٹر سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک ریسرچ کراچی — ۶۰
- مقالات حفاظت قرآن (۵)
  جمع و ترتیب قرآن سے متعلق شیعی نقطۂ نظر۔ خالد مسعود صاحب — ۶۶
- تقریظ و تنقید
  تاریخ دعوت و عزیمت (حصہ سوم) (خ۔م) — ۶۹

ترسیل زر اور خط و کتابت کا پتہ
منیجر ماہنامہ "میثاق"
رحمان پورہ ——— اچھرہ لاہور ۱۲

ہندوستانی خریداروں کیلئے ترسیل زر کا پتہ
منیجر ہفت روزہ "ندائے ملت"
باغ گونگے نواب ——— لکھنؤ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تذکرہ و تبصرہ

ہمارے سامنے اس وقت قانون تحفظ امن عامہ سے متعلق وہ ترمیمی بل ہے جو ہماری مغربی پاکستان اسمبلی نے ابھی حال ہی میں بڑی بھاری اکثریت سے پاس کیا ہے۔ اس بل کے ذریعہ سے یہ قرار دیا گیا ہے کہ اگر کسی جماعت کو خلاف قانون قرار دے دیا جائے تو ایسے تمام افراد کے متعلق جو ایک ہفتہ قبل تک اس جماعت سے وابستہ رہے ہوں یہ تصور کیا جائے گا کہ وہ امن عامہ کے خلاف سرگرمیوں میں مصروف تھے۔

ہم اس بل کے پاس کرنے پر اپنی معزز اسمبلی کے محترم ممبروں کو مبارک باد نہیں دے سکتے۔ یہ حضرات ہماری قوم کے تعلیم یافتہ اور اونچے طبقہ کے لوگ ہیں۔ ان سے بجا طور پر ہم یہ توقع رکھتے تھے کہ یہ قانون و آئین کی اس حقیقت سے واقف ہوں گے کہ ہر ملک و قوم کا قانون اس کے تصور عدل اس کے اجتماعی ارادہ اور اس کے شعور شہریت و جمہوریت کا مظہر ہوتا ہے۔ پھر یہ حضرات خوش قسمتی سے مسلمان بھی ہیں۔ مسلمان اس دنیا میں خدا کے قانون عدل و انصاف کے گواہ اور اس کے قائم کرنے والے ہیں۔ ان پہلوؤں کو سامنے رکھتے ہوئے جب ہم اس بل کو دیکھتے ہیں تو ہمیں سخت شرمندگی ہوتی ہے کہ دنیا ہمارے تصور عدل و انصاف کے متعلق کیا رائے قائم کرے گی اور ہمارے یہ معزز ممبران کل کو خدا کے آگے کیا جواب دینگے! اگر یہ ترمیم ایک آرڈیننس کی شکل میں آتی جب بھی ہر صاحب احساس کے دل پر گراں گزرتی، چہ جائیکہ اسمبلی کی بھاری اکثریت کی تائید و تصدیق کے ساتھ یہ ہمارے صوبے کی کتاب قانون میں جگہ پائے۔ گزرے زمانوں میں انگریز اور فرانسیسی

اپنی افریقی نوآبادیات کیلئے ایسے قوانین بنایا کرتے تھے، اب یہ کتنے صدمے کی بات ہے کہ ایک آزاد قوم کے آزاد ممبران خود اپنی قوم کے لئے ایسے قانون بنا ڈالتے ہیں اور نہ تو ان کا ضمیر کوئی خجالت محسوس کرتا اور نہ ان کی پیشانی ذرا عرق آلود ہوتی۔ قانون تحفظ امن عامہ کی برش پہلے ہی کیا کم تھی کہ اس پر اس ترمیم کی سان بھی ضروری سمجھی گئی۔ ہمارے یہ معزز ممبران جس پارٹی کے ممبر ہیں اس کا جماعتی منشور ابھی تازہ تازہ ہمارے سامنے آیا ہے۔ اس میں جمہوریت اور اسلام دونوں کے حقوق ادا کرنے کے جو بلند بانگ دعوے کئے گئے ہیں کیا ان کی تعبیر یہی ہے؟ ہمارے مرکزی وزیر قانون صاحب نے ابھی کل اعلان فرمایا ہے کہ ہم نے سارے خلاف اسلام قوانین اسلامی مشاورتی کونسل کے حوالہ کر دیئے ہیں کہ وہ اسلام کی روشنی میں ان میں ترمیم کا مشورہ دے۔ ایسے وعدوں کے ساتھ جب یہ کارنامے سامنے آتے ہیں تو ان کا اثر دلوں پر وہی پڑتا ہے جو پڑنا چاہیئے۔ ہمارے معزز ممبروں کو یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ اقتدار آنی جانی چیز ہے، باقی رہنے والی چیز خدمات و روایات ہیں۔ اگر کوئی اچھی روایت نہ قائم ہو سکے تو چنداں قابل ملامت نہیں لیکن یہ تو نہ ہو کہ کوئی بُری روایت قائم ہو جائے۔

ترمیم پاس کرنے والوں نے اگر خالی ذہن اور مجہول ارادے کے ساتھ یہ پاس کی ہوتی تو اس کو نظر انداز کیا جا سکتا تھا لیکن ہر شخص جانتا ہے کہ اس ترمیم میں جماعت کا لفظ گو لفظاً نکرہ ہے لیکن ہے یہ بہت بڑا معرفہ۔ اس معہود جماعت کے متعلق کیا ہمارے ان معزز ممبروں کے ضمیر کی شہادت یہی ہے کہ یہ چوروں اور ڈاکوؤں کی ایک جماعت تھی جس کے اصل سرغنوں کو پکڑ لینے کے بعد ضروری ہو گیا ہے کہ ان کے ساتھ وابستہ رہنے والوں کو بھی چور اور ڈاکو ہی سمجھا جائے۔ ہم یقین رکھتے ہیں کہ ان حضرات سے یہ بڑی ناانصافی ہوئی ہے۔ ہم خود اس جماعت کے مشہور مخالفوں میں سے ہیں لیکن اس کے باوجود ہم یہ جانتے ہیں کہ یہ لوگ اسلام اور ملک دونوں کے مخلص اور وفادار ہیں اور اس جماعت کے لیڈر نے اسلام اور پاکستان دونوں کی بڑی خدمت کی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے جس کا انکار ناممکن ہے کہ پاکستان کی تحریک کی کامیابی میں سب سے بڑی نظری روکاوٹ اگر کوئی تھی تو متحدہ قومیت کے نظریہ کے سبب سے تھی۔ اس نظریہ کی بیخکنی اور دو قومی نظریہ کے اثبات کے لئے مذہب کی روشنی میں جو دلائل اور جو جاندار لٹریچر اس جماعت کے لیڈر نے فراہم کئے اس میں

اس کا شریک و سہیم کم از کم ان لوگوں میں تو کوئی بھی نہیں ہے جو آج اس کو پاکستان کا مخالف قرار دیتے ہیں۔ اب اقتدار کی کشمکش میں اگر یہ لوگ آپ کے حریف بننا چاہتے ہیں تو یہ شوق انہیں بھی پورا کرنے کا حق ہے۔ جب آپ جمہوریت کا نام لیتے ہیں تو جمہوریت کی لنکا میں تو ہر شخص باون گز کا ہوتا ہے۔ آخر جو چیز آپ کے لئے جرم نہیں وہ ان کے لئے کیوں جرم قرار پاسے؟۔ اسی طرح یہ بات بھی صاف ہے کہ سیاست میں مذہب کا نام لینا جب آپ اپنے لئے ضروری سمجھتے ہیں، جیسا کہ مسلم لیگ کے منشور سے ثابت ہے، تو پھر دوسرے اگر اس کا حوالہ دیں تو اس پر کیوں اعتراض ہو؟

ہماری گزارش کا منشا یہ ہے کہ سیاسی رقابت کا نتیجہ یہ ہرگز نہیں ہونا چاہیئے کہ مخالف پارٹیاں یہ محسوس کرنے پر مجبور ہو جائیں کہ صوبے یا ملک کی قانون ساز مشینری گویا ان کے تعاقب میں لگ گئی ہے۔ یہ احساس لوگوں میں بد دلی اور مایوسی پیدا کرے گا اور اس سے نہایت غیر صحتمندانہ رجحانات کے پرورش پانے کا امکان ہے۔ ہم صوبائی اور مرکزی اسمبلی کے ارکان اور وزراء، مسلم لیگ کے لیڈروں اور خاص طور پر ریاست اور مسلم لیگ دونوں کے صدر محترم ایوب خان صاحب سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اپوزیشن پارٹیوں کے معاملے میں پوری فراخدلی کا ثبوت دیں، ہونے والے انتخابات گھٹی ہوئی فضا کے بجائے کھلی ہوئی فضا میں کرائیں۔ اس سے دنیا میں ہمارے ملک کا بھی وقار بڑھے گا اور ہمیں امید ہے کہ اس سے صدر ایوب کے وقار میں بھی بڑا اضافہ ہوگا۔

(۲)

میثاق کے اس شمارے میں ہم "مذہب اور خاندانی منصوبہ بندی" کے عنوان سے ڈاکٹر فضل الرحمان صاحب کا ایک مقالہ شائع کر رہے ہیں۔ اس مقالہ کی اشاعت سے ہمارا مقصود اس پر تنقید کرنا ہے۔ یہ مقالہ ڈاکٹر صاحب موصوف نے اس سیمینار میں پیش کیا ہے جو مارچ کے شروع میں پاکستان کی بڑھتی ہوئی آبادی کے خطرات اور ان کے سدباب کی تدابیر پر غور کرنے کے لئے لاہور میں منعقد ہوا تھا اور جس کی اہمیت کا اندازہ کرنے کے لئے تنہا یہ بات کافی ہے کہ اس کا افتتاح ہمارے محترم صدر ریاست نے فرمایا۔

خاص ڈاکٹر فضل الرحمان صاحب کے مقالے کو ہم نے تنقید کے لئے اس وجہ سے منتخب

کیا کہ محترم ڈاکٹر صاحب اس مرکزی اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر ہیں جو ہماری حکومت کے زیر اہتمام قائم ہوا ہے اور جس کا مقصد دینی و مذہبی مسائل میں ان خطوط کو معین کرنا ہے جن پر اس ملک کے سماجی، معاشرتی اور سیاسی نظام کو آگے بڑھنا ہے۔ ہمارے ملک کے دستور میں جس اسلامی نظام زندگی کا وعدہ کیا گیا ہے اس کی تعبیر کی ذمہ داری اصلاً مذکورہ ادارے ہی پر ہے۔ ہماری اسلامی مشاورتی کونسل بھی اس بات کی پابند ہے کہ وہ تخریج مسائل میں اجتہاد کے انہی اصولوں کو رہنما بنائے جو یہ ادارہ قائم کر دے۔ اس اعتبار سے ڈاکٹر صاحب موصوف اس وقت اس ملک کے سب سے بڑے سرکاری دینی رہنما ہیں۔ موصوف کی یہ شرعی اہمیت متقاضی ہوئی کہ ہم ان کے مقالے کو خاص اہمیت دیں اور اس پر تبصرہ کریں۔

یہ تبصرہ اسی اشاعت میں ہم دے دیتے لیکن ایک خاص مانع کے سبب سے اس کو آئندہ اشاعت کے لئے اٹھا رکھنا پڑا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے اس مقالے میں امام غزالیؒ اور حنفی فقہا کے متعلق یہ دعویٰ کیا ہے کہ یہ لوگ ضبط ولادت کے جواز کے بڑے پرزور حامی ہیں لیکن اپنے اس دعوے کے ثبوت میں کوئی حوالہ نہیں نقل کیا ہے جس سے معلوم ہو سکے کہ یہ بات وہ کس سند پر فرما رہے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی یہ فروگزاشت اگر ارادی نہیں ہے تو ہمارے لئے موجب حیرت ہے۔ انہوں نے مستشرقین کے آغوش علم میں تربیت پائی ہے، مستشرقین کا معروف طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنی ہر بات کا ماخذ بقید صفحہ و سطر ضرور بتاتے ہیں اگرچہ وہ حوالہ کتنا ہی بے تعلق اور غلط کیوں نہ ہو۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے اُستادوں کی اس سنت کے بالکل خلاف صرف دعوے پر اکتفا فرمایا ہے، اس کی کوئی دلیل پیش کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی ہے، گویا امام غزالیؒ اور ان کے ہم خیال فقہاء کی یہ رائے ایسی معلوم و مشہور حقیقت ہے جس میں کسی کے لئے کسی شک کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ اگرچہ ہمیں اچھی طرح اندازہ ہے کہ امام غزالیؒ کی اس رائے سے استفادہ کریں۔ اس کے لئے ہم نے ڈاکٹر صاحب کو خط لکھ دیا ہے کہ ازراہ نوازش وہ اپنے ماخذوں سے مطلع فرمائیں۔ ان کے جواب کے انتظار میں ہم نے اپنا تبصرہ روک لیا ہے۔ ان شاء اللہ آئندہ اشاعت میں ہم اسے دے سکیں گے۔

(۳)

کلکتہ کے لرزہ خیز واقعات کے بعد ایک ہلکی سی امید بندھی تھی کہ اب شاید بھارت کی قیادت

کا ضمیر بیدار ہوا اور وہاں گاندھی جی کے نام لینے والوں میں کچھ لوگ اصلاح حال کے لئے آخری بازی کھیل جانے کے لئے اُٹھ کھڑے ہوں لیکن افسوس ہے کہ بعد کے حالات نے ہماری آخری اُمید کا بھی خاتمہ کر دیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہاں کی قیادت میں یا تو اصلاح حال کا کوئی ارادہ ہی موجود نہیں ہے یا اس نے حالات کے آگے اب بے بس ہو کر ڈگ ڈال دیئے ہیں۔ ان دونوں میں سے جو بات بھی ہو نہایت ہی افسوسناک ہے اور یہ جتنی افسوسناک ہمارے لئے ہے اس سے ہزار درجہ افسوسناک خود بھارت کے لئے ہے۔

ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے اب صرف خدا کا سہارا باقی رہ گیا ہے۔ حکومت جب خود جانبدار یا بے بس ہو تو نہ حفاظت خود اختیاری کا سوال پیدا ہوتا نہ حکومت سے کسی امید والتجا کا۔ لیکن خدا کا سہارا جس کا ہم نے حوالہ دیا ہے بہت بڑا سہارا ہے اگر مسلمان اس سہارے کے اعتماد پر تمام دوسرے سہاروں سے بے نیاز و بے پروا ہو گئے تو خدا ان کی نصرت کے لئے خود اُتر آئیگا۔

پاکستان کے لئے ایک عظیم اخلاقی فتح حاصل کرنے کا ایک نہایت شاندار موقع قدرت نے فراہم کر دیا ہے۔ وہ یہ کہ خواہ بھارت کے مسلمانوں پر کچھ ہی گزر جائے لیکن وہ اپنی اقلیتوں کی ہر قیمت پر حفاظت کرے اور ان میں سے کسی ایک فرد کا بھی بال بیکا نہ ہونے دے۔ اگر پاکستان نے اس میں کامیابی حاصل کر لی، اور ہمیں اُمید ہے کہ وہ ضرور کامیابی حاصل کریگا تو اس سے مسلمان قوم کی طویل تاریخ جہاں بانی میں ایک اور نہایت روشن باب کا اضافہ ہوگا۔ بھارت کی سیکولرزم برسر بازار رسوا ہو چکی ہے، اس کے دستور کے تمام تحفظات مسلمانوں کے لئے بے معنی ثابت ہوئے لیکن پاکستان کے لئے پورا موقع باقی ہے کہ وہ دنیا پر ثابت کر دے کہ وہ جس دین کا نام لیوا ہے اس میں رواداری اور اقلیتوں کے حقوق کا کیا مقام ہے۔ یہ چیز دنیا میں بھی پاکستان کے وقار کو بلند کرے گی اور خدا کی نظروں میں بھی پاکستان اور اہل پاکستان کو سرخرو بنائے گی۔ اور چاہنے کی اصلی چیز یہی ہے۔

پاکستان میں داخل ہونے والے مہاجرین کا مسئلہ بھی ان شاء اللہ پاکستان حل کرنے سے قاصر نہیں رہے گا۔ اگر ہمارے دلوں میں اپنے مظلوم دینی بھائیوں کے لئے جگہ ہے تو ان شاء اللہ ہمارے ملک کی زمین ان کے لئے تنگ ثابت نہیں ہوگی۔ وسائل و ذرائع سب خدا کے

ہاتھ میں ہیں۔ ہمارا کام اپنے دلوں کو کشادہ اور حوصلوں کو بلند رکھنا اور اپنے فرائض کو پورے عزم و جزم کے ساتھ ادا کرنا ہے۔ ہمارا عقیدہ تو یہ ہے کہ جو لوگ آتے ہیں وہ اپنا مستقبل اپنے ساتھ لاتے ہیں۔ **کون کہہ سکتا ہے کہ کل دنیا کا نقشہ کیا ہوگا اور خدائے کارساز کے مخفی ارادے کن شکلوں میں ظاہر ہوں گے۔**

(۴)

مدرسہ اصلاح البنات کو جو طالبات کی تعلیم و تربیت کے لئے بارہ سال سے میری اہلیہ کے زیر اہتمام قائم تھا، اب ہم ایک خالص دینی تربیت گاہ کی صورت میں تبدیل کرنے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ اب تک یہ مڈل تک سرکاری نصاب کی تعلیم کا ایک مدرسہ تھا اور اس میں دین کا حصہ نصاب کی پابندیوں کی وجہ سے بس تھوڑا ہی سا شامل کیا جا سکتا تھا اور یہ بھی محض ایک عارضی مدت کے لئے جس کے کسی پائیدار اثر کی کوئی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ یہ چیز ہماری طبیعت پر شاق گزرتی تھی کہ یہ ساری کھکھیڑ ہم محض سرکاری نصاب کے لئے برداشت کر رہے ہیں۔ اگرچہ مجرد تعلیم کی خدمت بھی ایک خدمت ہے لیکن اس تعلیم کے لئے لاہور میں مدرسے بے شمار ہیں، ہمارے پیش نظر تو اصل چیز دینی تعلیم ہے جس کا انتظام یہاں نہ ہونے کے برابر ہے، خاص طور پر طالبات کے لئے۔ اس وجہ سے اب ہم نے طے کیا ہے کہ ہم اپنے وسائل و ذرائع کی حد تک اب ساری کوشش اس بات کے لئے کریں گے کہ کچھ طالبات دین سیکھ جائیں۔ اس مقصد کے لئے ہمارے سامنے وہی اسکیم ہے جو ہم نے حلقہ تدبر قرآن کے لئے اختیار کی ہے۔ اس وقت کم و بیش سوا سو طالبات زیر تعلیم تھیں۔ اگر اس کی تہائی تعداد بھی دین سیکھنے کے لئے آمادہ ہو گئی تو ہمارے اطمینان کے لئے یہ کافی ہے۔

حلقہ تدبر قرآن کا کام پابندی سے جاری ہے۔ مسلم شریف کے متعلق ہم نے اعلان کیا تھا کہ رمضان میں ہم ختم کر دیں گے لیکن یہ اندازہ غلط نکلا۔ ابھی اس کا تھوڑا سا کام باقی ہے۔ اس وقت اس کے جو ابواب زیر درس ہیں وہ زیادہ تر ان مسائل سے تعلق رکھنے والے ہیں جو موجودہ دور میں ہمارے ملک کے تمام حلقوں میں زیر بحث ہیں اس وجہ سے درس کی رفتار سست کرنی پڑی تاکہ ان مسائل کے سارے پہلو طلبہ کے سامنے آ جائیں۔ مسلم شریف سے فارغ ہوتے ہی بدایۃ المجتہد کا درس شروع

ہو جائے گا۔ قرآن مجید خدا کے فضل سے مقررہ مقدار کے مطابق ہو چکا ہے۔ اب اس کے درس میں بعض مناسب حال تبدیلیاں کرنے کا ارادہ ہے۔

ہمارے مخلصین میں سے میاں فضل احمد صاحب لائل پور اور منشی غوث محمد صاحب رحیم یار خاں نے حلقہ کی اعانت میں شرکت کی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ اس وقت ہماری سب سے بڑی ضرورت کتابوں کی ہے۔ ضروری کتابوں کی فہرست ہم تیار کر رہے ہیں۔ اگر مطلوب کتابوں کی ایک قسط بھی منگوانے کا سامان خدا نے کر دیا تو ہم اس کے منگوانے کی کوشش کریں گے۔ ریسرچ کے کاموں کے لئے جن کتابوں کی ضرورت ہے اول تو وہ یہاں پاکستان میں ملتی نہیں، باہر سے منگوانی ہوں گی، پھر ان کی قیمتیں اتنی زیادہ ہیں کہ فہرستوں پر نظر ڈالئے تو ہمت چھوٹ جاتی ہے۔ اس وقت تو صورت حال یہ ہے کہ جب کسی کتاب کی ضرورت پیش آتی ہے (اور یہ ضرورت اکثر پیش آتی ہے) تو کسی لائبریری سے مستعار حاصل کرنے کے لئے دوڑ دھوپ کرنی پڑتی ہے اور ضروری نہیں کہ اس کوشش میں کامیابی ہو جائے۔ تحقیق و تنقید کی جنگ میں اسلحہ کی حیثیت کتابوں کو حاصل ہے، بغیر ہتھیار کے تو یہ لڑائی نہیں لڑی جا سکتی!۔

جو نئے حضرات اس حلقہ میں شامل ہونا چاہتے ہیں وہ اس امر کا مضبوط عہد کر کے اس میں شامل ہوں کہ کم از کم دو گھنٹے روزانہ وہ تین سال تک اس کے لئے وقف کریں گے۔ اس ارادے کے بغیر کوئی صاحب اس میں شامل ہونے کی زحمت نہ اُٹھائیں ورنہ ان کی اور ہماری دونوں کی محنتیں ضائع ہوں گی۔

تدبر قرآن

امین احسن اصلاحی

تفسیر سورۂ بقرۃ

وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْا وَتَتَّقُوْا وَتُصْلِحُوْا بَيْنَ النَّاسِ ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝۲۲۴

"عُرْضَة" کے معنی ہدف اور نشانہ کے ہیں۔ اللہ کو قسموں کا ہدف بنانے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے نام پر بے ضرورت اور لایعنی قسمیں یا ایسی قسمیں کھائی جائیں جو نیکی و تقوٰی اور مقصد اصلاح کے خلاف ہوں۔ خدا کے عظیم نام کو لایعنی قسموں کے لئے استعمال کرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص مچھر مارنے کے لئے توپ داغتا پھرے اور نیکی و تقوٰی کے خلاف قسموں کے لئے اس کے پاک نام کو استعمال کرنا گویا اسی کے نام سے نیکی اور تقوٰی کی جڑ کاٹنا ہے جو تمام نیکی اور تمام خیر کا سرچشمہ ہے۔

عربی زبان میں "اَنْ" سے پہلے بعض حالات میں مضاف اور بعض مواقع میں اسکے بعد حرف "لَا" کو حذف کر دیتے ہیں۔ اس محذوف کو سیاق و سباق سے سمجھتے ہیں۔ یہاں واضح قرینہ ہے کہ "اَن" کے بعد "لا" محذوف ہے۔ قرآن میں اس کی مثالیں بہت ہیں۔ استاذ امامؒ نے اس کے شواہد اپنی کتاب الاسالیب میں جمع کر دیئے ہیں۔

بر، تقوٰی اور اصلاح کے تینوں لفظوں نے یہاں خیر اور نیکی کے تمام اقسام کو جمع کر لیا ہے۔ "بر" ان تمام نیکیوں پر حاوی ہے جن کا تعلق والدین، رشتہ داروں، مسکینوں، یتیموں اور دوسرے حقوق العباد سے ہے، "تقوٰی" ان نیکیوں پر حاوی ہے جو حقوق اللہ سے متعلق ہیں اور "اصلاح" سے مراد وہ نیکیاں ہیں جو معاشرہ سے تعلق رکھنے والی ہیں۔

یہ آیت آگے بیان ہونے والے مسائل کی تمہید ہے۔ آگے ایلاء کا اور اس کے بعد نکاح و طلاق سے متعلق بعض اہم مسائل کا ذکر آ رہا ہے۔ ایلاء اس قسم کو کہتے ہیں جو کوئی شخص بیوی سے ازدواجی تعلق نہ رکھنے کے لئے کھا بیٹھے۔ قسم چونکہ تمام معاشرتی، سماجی اور سیاسی معاملات و معاہدات میں اعتماد و استحکام کا ذریعہ ہے اور اس سے تمدن کے نہایت اعلیٰ مقاصد پورے ہوتے ہیں اس وجہ سے ایلاء اور نکاح و طلاق کے مسائل سے پہلے خود قسم کی اہمیت واضح کرنے کے لئے یہ فرمایا کہ خدا کے نام کو کبھی ایسی قسموں کے لئے استعمال کرنا جائز نہیں ہے جو نیکی و تقویٰ اور اصلاح کے منافی ہوں، خدا کی قسم کھانے کے معنی اس کو گواہ ٹھہرانے کے ہیں، اگر کوئی شخص اس کے نام پر کوئی ایسی قسم کھاتا ہے جو نیکی یا سچائی یا عدل کی مخالفت کے لئے ہے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ خدا کو خود خدا کے خلاف اور شیطان کے حق میں گواہ بنانا چاہتا ہے۔ اس قسم کی تمام قسمیں خدا کے ساتھ مذاق کے ہم معنی ہیں اس وجہ سے ایسی قسمیں اول تو جائز نہیں ہیں لیکن اتفاق سے کوئی شخص کھا بیٹھے تو اسلام نے ان کو توڑ دینے کا حکم دیا ہے۔

اخیر میں سمیع اور علیم کے حوالہ میں کچھ دھمکی کا انداز ہے کہ جو لوگ خدا کے قدوس نام کو اس طرح تختۂ مشق ستم بنائیں گے وہ اس حقیقت کو نہ بھولیں کہ خدا سننے والا اور جاننے والا ہے، وہ ایسے گستاخوں کو سزا دیئے بغیر نہ رہے گا۔

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ۝ ۲۲۵ - یعنی اس مواخذہ سے صرف وہی قسمیں مستثنیٰ ہیں جو بالکل غیر ارادی طور پر زبان پر جاری ہو جاتی ہیں، جن کا تعلق دل سے نہیں بلکہ محض زبان سے ہوتا ہے، جو کسی نفع و نقصان کو پیش نظر رکھ کر نہیں کھائی جاتی ہیں بلکہ محض سخن تکیہ کے طور پر زبان سے اثنائے کلام میں ٹپک پڑا کرتی ہیں۔ لیکن جو قسمیں دل کے قصد و ارادہ اور قلب کے تعمد کا نتیجہ ہوں گی اور جن کا کوئی قریب یا بعید اثر آدمی کے اپنے یا دوسرے کے حقوق و مفادات پر پڑنے والا ہوگا، اگر ان میں خدا کے نام کو غلط طور پر استعمال کیا جائے گا تو اللہ تعالیٰ ان قسموں پر ضرور مواخذہ فرمائے گا۔

"لغو" قسموں کو اگرچہ مواخذہ سے مستثنیٰ رکھا ہے اس لئے کہ خدا غفور اور حلیم ہے لیکن ان کو "لغو" کے لفظ سے تعبیر کر کے واضح کر دیا کہ ثقہ اور سنجیدہ لوگوں کو ان سے بھی احتراز کرنا واجب ہے۔ قرآن میں شریف و شائستہ لوگوں کے جو اوصاف بیان ہوئے ہیں ان میں یہ بات خاص طور پر بیان ہوئی ہے

کہ وہ لغو چیزوں سے احتراز کرتے ہیں۔

لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ ۚ فَاِنْ فَآءُوْ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ ۲۲۶ - وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝ ۲۲۷ -

قسموں سے متعلق مذکورہ بالا تمہید کے بعد اب یہ ایک ایسا مسئلہ شرعی بیان ہو رہا ہے جس میں اصل عامل کی حیثیت قسم کو حاصل ہے۔ یہ مسئلہ ایلاء کا ہے۔ "ایلاء" "الایالو" سے باب افعال ہے۔ "الایالو" کا اصل لغوی مفہوم کسی امر میں کوتاہی اور کمی کرنا ہے اور "ایلاء" کے معنی کسی چیز کے ترک کی قسم کھا لینے کے ہیں۔ یہ عرب جاہلیت کی ایک اصطلاح ہے جس کا مفہوم بیوی سے زن و شوہر کا تعلق نہ رکھنے کی قسم کھا لینا ہے۔ چونکہ اس لفظ میں ترک کا مضمون خود موجود ہے اس وجہ سے قطع تعلق کے معنی کو ادا کرنے کے لئے کسی اور لفظ کی اس کے ساتھ ملانے کی ضرورت نہیں ہوئی۔

اس قسم کی قسم چونکہ ازدواجی مقاصد کے خلاف اور بر و تقویٰ کے منافی ہے، اس سے بیوی بالکل معلق ہو کے رہ جاتی ہے، اس وجہ سے اسلام نے اس طرح کی قسم کھا بیٹھنے والوں کے لئے چار ماہ کی حد مقرر کر دی ہے کہ اس مدت کے اندر یا تو وہ بیوی سے ازدواجی تعلقات بحال کر لیں یا طلاق دینے کا فیصلہ ہے تو اس کو طلاق دے دیں۔ جو پہلی شکل اختیار کریں گے ان کے متعلق فرمایا کہ اللہ مغفرت کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے یعنی اگرچہ ان کی قسم ایک حق تلفی پر مبنی تھی اور قسم کو کسی حق تلفی کے لئے سپر بنانا جائز نہیں لیکن اصلاح حال کے بعد اللہ تعالیٰ اس کوتاہی کو معاف کر دے گا۔ یہاں اگرچہ اس قسم کے توڑنے پر کسی کفارہ کا ذکر نہیں ہے لیکن قسموں کے توڑنے کے بارے میں قرآن نے دوسرے مقام میں جو عام ضابطہ بیان فرمایا ہے کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ یہ صورت اس سے مستثنیٰ رہے؟ اس وجہ سے ہم ان فقہاء کی رائے کو زیادہ قوی سمجھتے ہیں جو اس صورت میں بھی کفارہ کے قائل ہیں۔

دوسرے گروہ سے متعلق فرمایا کہ اگر انہوں نے طلاق کا فیصلہ کر لیا ہے تو وہ یہ راہ اختیار کر سکتے ہیں لیکن اس معاملے میں اللہ نے جو حدود و قیود مقرر کر دیئے ہیں ان کی پوری پوری نگہداشت ملحوظ رہے، اللہ ہر چیز کو سنتا اور جانتا ہے۔

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر چار ماہ کی مذکورہ مدت گزر جائے اور اس دوران میں ایک شخص نہ رجوع ہی کرے اور نہ طلاق ہی دے تو کیا ہوگا؟ فقہاء کا ایک گروہ اس سوال کا یہ جواب

دیتا ہے کہ چار ماہ کی مدت گزرتے ہی ایک طلاق آپ سے آپ پڑ جائے گی، بعض کے نزدیک یہ ایک طلاق بائن ہوگی اور بعض کے نزدیک رجعی، دوسرے گروہ کے نزدیک چار ماہ کی مدت گزرنے پر معاملہ قاضی کی عدالت میں پیش ہوگا اور وہ شوہر کو حکم دے گا کہ یا تو وہ رجوع کرے یا طلاق دے۔ قرآن کے الفاظ سے جو بات نکلتی ہے وہ یہ ہے کہ چار ماہ گزرنے پر شوہر کو بہر حال یہ فیصلہ کرنا ہے کہ وہ یا تو رجوع کرے یا طلاق دے۔ اگر وہ ان دونوں باتوں میں سے کوئی بات نہ کرے تو عورت ایسے شوہر سے بذریعہ عدالت طلاق حاصل کر لے گی۔

قرآن کے الفاظ سے یہ بات بھی ظاہر ہے کہ عورت کو طلاق حاصل کرنے کا یہ حق صرف اس صورت میں حاصل ہوگا جب شوہر نے بر بنائے بغض و نفرت بیوی سے نہ ملنے کی قسم کھائی ہو اور پیش نظر اس کو معلق بنا کے رکھنا ہو۔ اگر یہ صورت نہ ہو بلکہ کسی اور وقتی اور عارضی مصلحت، خواہ بتقاضائے صحت یا بارادۂ تنبیہہ، کوئی شخص بیوی سے مخصوص ازدواجی تعلق منقطع رکھے تو یہ صورت اس حکم کے تحت نہیں آتی اگرچہ اس انقطاع کی مدت چار ماہ سے متجاوز ہی کیوں نہ ہو جائے۔

وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ۭ وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْٓ اَرْحَامِهِنَّ اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا ۭ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۠ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝ ۲۲۸ ——— "قروء" قرء کی جمع ہے اس کے معنے کی تعیین میں اہل لغت نے اختلاف کیا ہے۔ بعض نے اس کے معنی حیض کے لئے ہیں اور بعض نے طہر کے۔ اس کے اصل مادہ اور اس کے مشتقات پر ہم نے جس قدر غور کیا ہے اس سے ہمارا رجحان اسی بات کی طرف ہے کہ اس کے اصل معنی تو حیض ہی کے ہیں لیکن چونکہ ہر حیض کے ساتھ طہر بھی لازماً لگا ہوا ہے اس وجہ سے عام بول چال میں اس سے طہر کو بھی تعبیر کر دیتے ہیں۔ جس طرح رات کے لفظ سے اس کے ساتھ لگے ہوئے دن کو یا دن کے لفظ سے اس کے ساتھ لگی ہوئی رات کو۔ اس قسم کے استعمال کی مثالیں ہر زبان میں مل سکتی ہیں۔

یہاں جو مسئلہ بیان ہوا ہے اس کا ظاہری قرینہ بھی اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ "قروء" سے مراد حیض ہی ہے۔ اس لئے کہ آیت میں مطلقہ عورتوں کو جس توقف کی ہدایت ہے اس کی اصل حکمت،

جیسا کہ اس آیت سے خود واضح ہے، یہ ہے کہ یہ متعین ہو جائے کہ وہ حاملہ نہیں ہیں۔

ظاہر ہے کہ حاملہ ہونے اور نہ ہونے کا فیصلہ اصلاً حیض ہی سے ہوتا ہے نہ کہ طہر سے۔ اس وجہ سے اس کو حیض ہی کے معنی میں لینا زیادہ اقرب ہے۔ معنی کے اس اختلاف کی وجہ سے زمانہ عدت کے تعین میں حنفیہ اور شافعیہ کے درمیان اختلاف ہوا جو فقہ کی کتابوں میں مذکور ہے۔

اصل مقصود اس تین حیض کی مدت سے چونکہ یہ متعین کر لینا ہے کہ عورت حاملہ ہے یا نہیں، اس لئے کہ اس پر بہت سے اہم امور کا انحصار ہے اس وجہ سے ان مطلقات کے ایمان و اسلام کا یہ لازمی تقاضا ٹھہرایا ہے کہ اگر حمل کے قسم کی کوئی چیز وہ محسوس کرتی ہیں تو اس کو چھپانے کی کوشش نہ کریں ورنہ اس سے ان تمام مطالح کو سخت نقصان پہنچے گا جو شریعت نے اس حکم میں عورت اور مرد اور پیٹ میں موجود بچے کے لئے ملحوظ رکھے ہیں۔

اس مدت کے دوران میں شوہر کو حق حاصل ہے کہ وہ اگر سازگاری اور بحالی تعلقات کا طالب ہے تو وہ مراجعت کر سکتا ہے۔ شریعت میں میاں بیوی کے تعلق کو بڑی اہمیت دی گئی ہے، اس کا ٹوٹنا صرف اسی صورت میں گوارا کیا گیا ہے جب سازگاری کا کوئی امکان باقی نہ رہ گیا ہو۔ اس وجہ سے یہ مدت رکھ دی گئی ہے جس میں دوسرے مصالح کے ساتھ یہ مصلحت بھی ہے کہ اگر طلاق کا باعث کوئی وقتی ناراضگی ہوئی ہے تو فریقین اطمینان کے ساتھ ٹھنڈے دل سے اپنے معاملے پر نظر ثانی کر سکتے ہیں۔ لیکن قرآن نے شوہر کے اس حق مراجعت کے ساتھ ساتھ یہ شرط بھی لگا دی ہے کہ یہ صرف بارادۂ اصلاح یعنی خوشگواری اور محبت کے ساتھ ازدواجی زندگی گزارنے کے لئے ہو، اس سے ہرگز ہرگز عورت کو تنگ کرنا اور ستانا نہ ہو، ورنہ یہ اس حق کا نہایت ظالمانہ استعمال ہوگا جو اللہ کی ناراضگی کا باعث ہے۔

اس کے بعد عورت اور مرد دونوں کے ایک دوسرے پر حقوق کی نہایت جامع الفاظ میں وضاحت فرما دی ہے کہ شوہروں کو یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ حقوق صرف انہی کے ہیں، بیویوں کا کوئی حق ہی نہیں ہے بلکہ جس طرح ان پر شوہروں سے متعلق فرائض اور ذمہ داریاں ہیں اسی طرح دستور کے مطابق شوہروں پر ان کے حقوق بھی ہیں، اور یہ فرائض اور یہ حقوق دونوں بالکل متوازن ہیں، ہر شوہر کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے حقوق کے مطالبہ کے ساتھ ساتھ بیوی کے حقوق کا بھی لحاظ کرے، اسی لحاظ پر میاں بیوی کے

سنجوگ اور ان کی ازدواجی زندگی کی خوشگواری کا انحصار ہے۔

البتہ یہ بات ہے کہ خاندانی نظام کے بقا و استحکام کے نقطۂ نظر سے اسلام نے مرد کو عورت پر ایک درجہ ترجیح کا دیا ہے۔ اس ترجیح سے مراد، جیسا کہ قرآن کے دوسرے مقامات کی تصریحات سے واضح ہے، یہ ہے کہ خاندان کا قوام اور سربراہ اسلام نے عورت کو نہیں بلکہ مرد ہی کو بنایا ہے۔ جس طرح ایک ریاست کا نظم ایک سربراہ کی سربراہی کا محتاج ہے، اسی طرح چھوٹے پیمانہ پر ایک گھر کا نظم بھی ایک قوام کی قوامیت کا محتاج ہے اور اس قوامیت کے لئے اپنی فطرت اور اپنی صلاحیتوں کے لحاظ سے مرد ہی موزون ہے نہ کہ عورت۔

مرد کے وجہ ترجیح پر قرآن نے دوسری جگہ دلیل دی ہے اس وجہ سے یہ بحث اپنے مقام ہی پر موزون رہے گی[1]۔ یہاں جس چیز کی طرف ہم توجہ دلانا چاہتے ہیں وہ قرآن کے یہ الفاظ ہیں کہ "لِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ" اس کے معنی ظاہر ہیں کہ یہی ہو سکتے ہیں کہ "مردوں کو عورتوں پر ایک درجہ ترجیح حاصل ہے"۔ قرآن کے ان واضح الفاظ کی موجودگی میں ایک مسلمان کے لئے مساوات مرد و زن کے اس نظریے پر ایمان لانے کی تو کوئی گنجائش نظر نہیں آتی جو ہمارے ہاں مغرب سے درآمد ہوا ہے۔ قرآن اس امر کو تو تسلیم کرتا ہے کہ عورت پر جس درجے کی ذمہ داریاں ہیں، اسی کے ہموزن اس کے حقوق بھی ہیں لیکن وہ یہ تسلیم نہیں کرتا کہ عورت اور مرد دونوں ہر اعتبار سے بالکل برابر ہیں بلکہ صاف الفاظ میں مرد کو عورت پر ایک درجہ ترجیح دیتا ہے۔ یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ یہ جو فرمایا ہے کہ "وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ" تو اس کے معنی بھی ہرگز یہ نہیں ہیں کہ عورت اور مرد دونوں کے حقوق برابر ہیں بلکہ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ عورت پر جس طرح ذمہ داریاں ہیں، اسی طرح اس کے حقوق بھی ہیں۔

قرآن نے اسی "لِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ" کے اصول کو بنیاد قرار دے کر خاندان میں قوامیت اور سربراہی کا مقام، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، مرکز دیا ہے اور پھر اسی پر اس نے تمام عائلی قوانین و احکام کی بنیاد رکھی ہے۔ اگر اس بنیاد کو ڈھا کر مغربی نظریہ مساوات کی اساس پر جو ہر اعتبار سے عورت و مرد دونوں کو ایک ہی درجہ میں رکھنے کا مدعی ہے، اسلام کے عائلی قوانین کو سمجھنے اور ڈھالنے کی کوشش کی جائے تو اس کوشش

[1] جو لوگ اس مسئلہ پر تفصیلی بحث کے طالب ہوں، وہ ہماری کتاب "پاکستانی عورت" پڑھیں۔ اس میں ہم نے اس مسئلہ کے ہر پہلو پر سیر حاصل گفتگو کی ہے، قرآن اور فلسفہ جدید دونوں کی روشنی میں۔

کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں نکل سکتا کہ پورا دین محرف ہو کر رہ جائے۔

آیت کے آخیر میں خدا کی دو صفتوں ـــــ عزیز اور حکیم ـــــ کا حوالہ ہے۔ خدا عزیز ہے اس وجہ سے اسی کو حق ہے کہ وہ حکم دے اور وہ حکیم ہے اس وجہ سے جو حکم بھی اس نے دیا ہے وہ سراسر حکمت پر مبنی ہے، بندوں کا کام یہ ہے کہ اس کے احکام کی بے چون وچرا اطاعت کریں۔ اگر وہ اس کے احکام کی مخالفت کریں گے تو اس کی غیرت وعزت کو چیلنج کریں گے اور اس کے عذاب کو دعوت دیں گے اور اگر خدا سے زیادہ حکیم اور مصلحت شناس ہونے کے خبط میں مبتلا ہوں گے تو خود اپنے ہاتھوں اپنے قانون اور نظام سب کا تیا پانچا کر کے رکھ دیں گے۔

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۪ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ ۭ وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْـــًٔا اِلَّآ اَنْ يَّخَافَآ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۭ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۙ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ ۭ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا ۚ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ ۲۲۹

اب یہ طلاق کا صحیح طریقہ بتا دیا کہ تمام معاشرتی زندگی کی بنیاد چونکہ نکاح کے پاکیزہ رشتے ہی پر ہے اس وجہ سے اگر کسی مجبوری کے باعث اس کے ٹوٹنے کی نوبت آئے تو یہ نہیں ہونا چاہیئے کہ آدمی ایک ہی جھٹکے میں اس مقدس رشتے کو توڑ تاڑ کے رکھ دے بلکہ مطلقہ کے لئے جس طرح یہ ہدایت ہے کہ وہ تین حیض تک انتظار کرے اسی طرح طلاق دینے والے کے لئے یہ ہدایت ہے کہ وہ الگ الگ تین طہروں میں دو مرتبہ میں طلاق دے اور پھر تیسرے طہر میں یا تو بیوی سے مراجعت کر لے اگر مراجعت کرنا چاہے یا اس کو رخصت کر دے اگر اس کا آخری فیصلہ اس کو رخصت کر دینے ہی کا ہے۔ مراجعت کی شکل میں اس کو معروف کی پابندی کی ہدایت کی گئی یعنی اس مراجعت سے مقصود بیوی کو اس طریقہ سے بیوی بنا کر رکھنا ہو جس طرح ایک شریف، مہذب اور خدا ترس آدمی بیوی کو رکھتا ہے۔ اور جس کا بھلے لوگوں میں چلن ہے، مقصود اس سے بیوی کو معلق رکھنا اور دکھ دینا نہ ہو۔ رخصت کرنے کی شکل میں اس کو احسان کی ہدایت ہوئی کہ ہر چند اب اس کا بیوی کی حیثیت سے کوئی حق باقی نہ رہا لیکن مرد کی مردانگی اور فتوت کی شان یہی ہے کہ جس کے ساتھ مہر ومحبت کے روابط رہ چکے ہیں اور جو ایک صنف ضعیف بھی ہے اس کو حسب توفیق دے دلا کر خوبصورتی کے ساتھ رخصت کرے۔

مطلقہ کے لئے تین حیض تک توقف میں جس طرح بہت سی مصلحتیں ہیں اسی طرح طلاق دینے والوں کے لئے مذکورہ ترتیب کے ساتھ طلاق دینے میں بہت سی برکتیں ہیں جن سے وہ لوگ محروم ہو جاتے ہیں جو غصہ اور جوش کی حالت میں شریعت کی اس ہدایت کی پیروی نہیں کرتے اور ایک ہی سانس میں تین یا اس سے زیادہ طلاقیں دے ڈالتے ہیں۔ اس طرح کے لوگ عموماً اپنے کئے پر زندگی بھر پچھتاتے ہیں لیکن ان کا یہ پچھتانا بالکل بے سود ہوتا ہے۔ شریعت نے یہ طریقہ اسی لئے بتایا ہے کہ ازدواجی رشتہ ایک نہایت اہم رشتہ ہے، اس کا ٹوٹنا نہیں بلکہ تا حد امکان اس کا جڑا رہنا مطلوب ہے، اس وجہ سے اس کے متعلق کوئی فیصلہ غصہ یا عجلت میں نہیں ہونا چاہیئے بلکہ سوچ سمجھ کر ٹھنڈے دل سے ہونا چاہیئے، اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب مذکورہ ہدایت پر عمل کیا جائے[۵]۔

وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْئًا (اور تمہارے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ تم نے ان کو جو کچھ دیا دلایا ہو اُن سے واپس لو) سے ظاہر ہے کہ نان نفقہ اور مہر وغیرہ کی قسم کی چیزیں مراد نہیں ہو سکتیں اس لئے کہ یہ چیزیں تو عورت کا حق ہیں، ان کو واپس لینے یا کرنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا اس وجہ سے اس سے لازماً وہ چیزیں مراد ہیں جو بطور تحفہ وغیرہ دی گئی ہوں۔ ان چیزوں کے بارے میں فرمایا کہ طلاق ہو جانے کے بعد مرد کے لئے یہ زیبا نہیں ہے کہ وہ ان کا حساب کتاب کرنے بیٹھ جائے۔ اس ممانعت کی وجہ، جیسا کہ ہم نے اُوپر اشارہ کیا، یہ ہے کہ اس قسم کی خست اس فتوت اور بلند حوصلگی کے منافی ہے جو ایک مرد میں ہونی چاہیئے۔ چنانچہ عورتوں کے معاملے میں قرآن نے مردوں کو اس فتوت کی طرف ایک سے زیادہ مقامات میں توجہ دلائی ہے، خاص طور پر تعلقات کے منقطع ہو جانے کی صورت میں۔ مثلاً وَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ لِتَذْهَبُوْا بِبَعْضِ مَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ ۱۹۔ نساء (اور ان کو اس مقصد سے تنگ کرنے کی کوشش نہ کرو کہ جو کچھ تم نے ان کو دیا تھا اس کو واپس لے سکو) دوسری جگہ ہے وَكَيْفَ تَاْخُذُوْنَهٗ وَقَدْ اَفْضٰى بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ وَّاَخَذْنَ مِنْكُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ۲۱۔ نساء (اور تم ان سے

---

[۵] یہ ملحوظ رہے کہ ہم اس بات کے قائل نہیں ہیں کہ اگر کوئی شخص اس ہدایت کے خلاف طلاق دے تو وہ طلاق واقع ہی نہیں ہوگی اس مسئلہ پر مفصل بحث ہم نے اپنی کتاب "عائلی کمیشن کی رپورٹ پر تبصرہ" میں کی ہے تفصیل کے طالب اس کو پڑھیں۔

کس طرح رہو گے جب کہ تم ایک دوسرے کی طرف محبت سے بڑھ چکے ہو اور وہ تم سے نہایت مضبوط عہد لے چکی ہیں) اور اسی بقرہ میں آگے مردوں کو خطاب کر کے یہ آیت آرہی ہے وَاَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ ۲۳۷ - بقرۃ (اور یہ کہ عورت کی طرف سے معافی کے خواہشمند ہونے کے بجائے تم اپنا حق چھوڑ دو، یہ زیادہ تقوٰی سے قریب ہے، اور تم میں سے ایک کو دوسرے پر جو ترجیح حاصل ہے اس کو نہ بھولو)

اس کے بعد وہ شکل بیان ہوئی ہے جو اس ممانعت سے مستثنٰی ہے۔ یہ وہ شکل ہے جب کہ بیوی کو بھی میاں سے ایسا اختلاف ہو کہ صاف نظر آرہا ہو کہ ازدواجی زندگی کے نباہ کے لئے جن حدود و قیود کی نگہداشت ضروری ہے ان کو فریقین ملحوظ نہیں رکھ سکتے تو اس امر میں کوئی حرج نہیں ہے کہ بیوی کوئی مال یا رقم فدیہ کے طور پر دے کر ایسے میاں سے چھٹکارا حاصل کر لے۔ شریعت کی اصطلاح میں اس کو خلع کہتے ہیں۔ اس صورت میں چونکہ غالب مصلحت عورت کی ہوتی ہے اس وجہ سے کمزور عنصر ہونے کے باوجود اس معاوضہ کو لینے کی اجازت دی گئی۔

قرآن کے الفاظ سے اس خلع کے متعلق دو باتیں نمایاں ہوتی ہیں۔

۱ - ایک تو یہ کہ اگر میاں بیوی آپس میں کوئی بات طے نہ کر سکیں تو عورت لازماً یہ معاملہ عدالت میں لے جا سکتی ہے اور عدالت خلع اور معاوضہ دونوں کا فیصلہ کرے گی۔ اس کا ثبوت، فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ (پس اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ میاں بیوی اللہ کے حدود کو قائم نہ رکھ سکیں گے تو....) سے ملتا ہے۔ اس میں خفتم کا خطاب ظاہر ہے کہ اسلامی معاشرہ سے بحیثیت مجموعی ہے اور معاملات و نزاعات میں معاشرے کی مداخلت عدالت ہی کے واسطہ سے ممکن ہے۔

۲ - دوسری یہ کہ خلع یا فسخ نکاح کے مطالبہ کا حق عورت کو اسی صورت میں ہے جب یہ ثابت ہو سکے کہ ازدواجی زندگی میں جن حدود اللہ کا قیام مطلوب ہے مرد ان کو قائم رکھنے کے قابل نہیں یا ان کو قائم نہیں رکھنا چاہتا اور عورت کے لئے ان کے قیام کے بغیر حدود اللہ پر قائم رہنا ناممکن یا دشوار ہے۔ اس کا ثبوت اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ سے ملتا ہے۔ اگر اختلاف محض ذوقی اور سطحی نوعیت کا ہے جس کو انگیز کیا جا سکتا ہے تو ایسی صورت میں عورت کو خلع یا فسخ نکاح کا مطالبہ لے کر نہیں اٹھنا چاہیئے۔ اگر چھوٹی چھوٹی باتوں پر عورت کو یہ حق استعمال کرنے کی راہ کھول دی جائے تو اس

سے خاندانی نظام کی چولیں ہل جائیں گی درانحالیکہ خاندان کے اس نظام ہی کو اسلام میں سیاسی نظام کی بنیاد قرار دیا گیا ہے۔ معاملہ کی اس اہمیت کی وجہ سے خلع یا فسخ نکاح کے مطالبہ کی شکل میں عدالت یہ دیکھے گی کہ کیا فی الواقع صورت معاملہ ایسی ہے کہ فریقین کے لئے نباہ ناممکن یا دشوار ہے یا محض کندھا بدلنے اور ذائقہ تبدیل کرنے کی خواہش ہے جس کے تحت عورت نے مرد کو عدالت میں کھینچ بلایا ہے۔

"تِلْكَ حُدُودُ اللّٰهِ الآیۃ" یہ ان تمام احکام و ہدایات سے متعلق ہے جو آیت (۲۲۲) سے لیکر یہاں تک بیان ہوئے ہیں۔ فرمایا کہ یہ تمہاری ازدواجی زندگی سے متعلق خدا کی حد بندیاں ہیں جس طرح تم اپنے رقبوں اور اپنی چراگاہوں کے ارد گرد حد بندیاں کرتے ہو اور یہ نہیں چاہتے کہ کوئی ان حدوں کو توڑے اور اگر کوئی ان حدود میں مداخلت کرتا ہے تو تم اس کو اپنی ملکیت میں مداخلت اور اپنی غیرت و عزت کے لئے ایک چیلنج سمجھتے ہو اسی طرح خدا نے بھی اپنے محارم کے ارد گرد یہ حدیں قائم کر دی ہیں، تم ان سے باہر آزاد ہو لیکن ان کے اندر تمہیں مداخلت کی اجازت نہیں ہے، اگر کسی نے ان حدوں کو توڑنے یا لانگنے کی جسارت کی تو وہ یاد رکھیں کہ وہی لوگ ظالم ہیں۔ یعنی اس کے نتیجے میں جو کچھ اس دنیا میں یا آخرت میں ان کے سامنے آئے گا اس کی ساری ذمہ داری خود انہی پر ہے، خدا پر نہیں ہے اور اس سے وہ اپنی ہی جانوں پر ظلم ڈھائیں گے خدا کا کچھ نہیں بگاڑیں گے۔ خدا کے قوانین تمام تر فطرت انسانی کے تقاضوں اور بندوں کے اپنے مصالح پر مبنی ہیں اس وجہ سے جو لوگ ان کو توڑتے ہیں وہ اپنی ہی فطرت اور اپنے ہی مصالح کی دھجیاں خود اپنے ہی ہاتھوں بکھیرتے ہیں:-

فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ؕ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يَّتَرَاجَعَآ اِنْ ظَنَّآ اَنْ يُّقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝ ۲۳۰ -

آخری طلاق دے چکنے کے بعد اگر کوئی شخص پھر اس عورت سے نکاح کرنا چاہے تو یہ اس کا حکم بیان ہو رہا ہے کہ جب تک وہ عورت کسی دوسرے شوہر سے نکاح نہ کرے اور وہ اس کو طلاق نہ دے اس وقت تک یہ عورت اپنے پہلے شوہر کے لئے جائز نہیں ہو سکتی۔ جس طرح اوپر والا حکم اس لئے دیا گیا ہے کہ طلاق کا فیصلہ غصہ یا عجلت میں نہ کیا جائے اسی طرح اس پابندی سے مقصود

طلاق کو ایک سہل کھیل بنانے سے بچاتا ہے۔ اگر طلاق کے بعد بھی طلاق دینے والے کے لئے اس عورت سے نکاح کی آزادی باقی رہتی تو بہت سے لوگ طلاق کی حقیقی اہمیت نہ سمجھ سکتے لیکن جب یہ پابندی لگ گئی کہ چھوڑی ہوئی بیوی دوبارہ اسی صورت میں مل سکتی ہے جب وہ کسی اور کی بیوی بنے اور وہ کسی سبب سے چھوڑے اور عورت اس سے نکاح پر راضی ہو تو گویا بیچ میں ایک پورا ہفتخواں حائل ہو گیا، ظاہر ہے کہ اب اس پابندی کے سامنے آجانے کے بعد جو طلاق دے گا وہ سو بار سوچ کر طلاق دے گا اور اسلام کا منشاء یہی ہے کہ جو بھی طلاق دے وہ خوب سوچ سمجھ کر طلاق دے، دُور تک سارے نتائج کو سامنے رکھ کر۔

"حَتّٰی تَنْکِحَ زَوْجًا غَیْرَہٗ" میں نکاح کا لفظ ہمارے نزدیک عقد نکاح ہی کے معنی میں ہے۔ جن لوگوں نے اس کو وطی کے معنی میں لیا ہے انہوں نے ایک غیر ضروری سا تکلف کیا ہے۔ قطع نظر اس سے کہ یہ معنی لینے سے بھی وہ مقصد حاصل نہیں ہوتا جو وہ حاصل کرنا چاہتے ہیں، یہاں اس لفظ کا طریق استعمال اس معنی سے ابا کر رہا ہے۔ یہاں تنکح کا فاعل ظاہر ہے کہ عورت ہے، اگر اس کے معنی وطی کے لئے جائیں تو اس کا ترجمہ ہوگا کہ "یہاں تک کہ وہ عورت کسی دوسرے شوہر سے وطی کرے"۔ وطی کرنا مرد کا کام ہے نہ کہ عورت کا۔ اور اگر یہ ترجمہ کریں کہ یہاں تک کہ "وہ کسی اور شوہر سے وطی کرائے" تو اس نادر معنی کے لئے ثبوت کہاں سے لائیں گے؟

اصل یہ ہے کہ لفظ نکاح شریعت اسلامی کی ایک معروف اصطلاح ہے جس کا اطلاق ایک عورت اور مرد کے اس ازدواجی معاہدہ پر ہوتا ہے جو زندگی بھر کے نباہ کے ارادے کے ساتھ زن و شو کی زندگی گزارنے کے لئے کیا جاتا ہے۔ اگر یہ ارادہ کسی نکاح کے اندر نہیں پایا جاتا تو وہ فی الحقیقت نکاح ہی نہیں ہے بلکہ وہ ایک سازش ہے جو ایک عورت اور ایک مرد نے باہم مل کر کر لی ہے۔ نکاح کے ساتھ شریعت نے طلاق کی جو گنجائش رکھی ہے تو وہ اصل اسکیم کا کوئی جزو نہیں ہے بلکہ یہ کسی ناگہانی افتاد کے پیش آجانے کا ایک مجبورانہ مداوا ہے۔ اس وجہ سے نکاح کی اصل فطرت یہی ہے کہ وہ زندگی بھر کے سنجوگ کے ارادے کے ساتھ عمل میں آئے۔ اگر کوئی نکاح واضح طور پر محض ایک معین و مخصوص مدت تک ہی کے لئے ہو تو اس کو متعہ کہتے ہیں اور متعہ اسلام میں قطعی حرام ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص اس نیت سے کسی عورت سے نکاح کرے کہ اس نکاح کے بعد طلاق دیکر وہ اس عورت کو اس

کے پہلے شوہر کے لئے جائز ہونے کا حیلہ فراہم کرے تو شریعت کی اصطلاح میں یہ حلالہ ہے اور یہ بھی اسلام میں متعہ ہی کی طرح حرام ہے۔ جو شخص کسی کی مقصد برآری کے لئے یہ ذلیل کام کرتا ہے وہ درحقیقت ایک قرم ساق یا بھڑوے یا جیسا کہ حدیث میں وارد ہے "کرایہ کے سانڈ" کا رول ادا کرتا ہے اور ایسا کرنے والے اور ایسا کرانے والے پر اللہ کی لعنت ہے۔

البتہ متعہ اور حلالہ میں اس اشتراک کے ساتھ ساتھ تھوڑا سا فرق بھی ہے۔ وہ یہ کہ متعہ صریح طور پر ایک متعین مدت کے لئے ہوتا ہے اس وجہ سے اس کے متعلق واضح طور پر ایک فقیہ یہ حکم لگا سکتا ہے کہ یہ نکاح منعقد نہیں ہوا لیکن حلالہ کی نوعیت ایک درپردہ سازش کی ہوتی ہے، اس کے متعلق کوئی ظاہری ثبوت اس بات کا موجود نہیں ہوتا کہ نکاح کے نام سے یہ اللہ کی شریعت کے ساتھ مذاق کیا گیا ہے اس وجہ سے اللہ کے نزدیک تو یہ نکاح اور یہ طلاق سب باطل ہوگا لیکن ایک فقیہ جو صرف ظاہر حالات کو سامنے رکھ کر فتویٰ دینے پر مجبور ہے وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس طرح کا نکاح سرے سے منعقد ہی نہیں ہوا۔ چنانچہ اسی بنیاد پر بعض فقہا اس کے انعقاد کو مانتے ہیں اور مجھے ان کی یہ بات قوی معلوم ہوتی ہے۔

رہی یہ بات کہ ایسی عورت اپنے پہلے شوہر کے لئے صرف اس صورت میں جائز ہوگی جب اس کا دوسرا شوہر اس کو وطی کے بعد طلاق دے تو کم از کم اس وطی کے لئے قرآن سے کوئی ثبوت نہیں نکلتا۔ تنکح کے لفظ سے جو دلیل دی جاتی ہے اس کا بے بنیاد ہونا، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، بالکل واضح ہے، پھر دیکھنے کی چیز یہ بھی ہے کہ فعل وطی کے واقع ہو جانے سے حلالہ کی سنگینی اور اس کی ملعونیت میں کیا کمی ہو جائے گی؟ اگر ایک نکاح حلالہ کی سازش کے تحت ہوا ہے تو اس بات سے اس کی نوعیت میں کیا فرق پیدا ہوتا ہے کہ طلاق قبل از وطی دی گئی یا بعد از وطی؟ اگر بغیر وطی کے دی گئی تو یہ بھڑوا پن ہے اور اگر وطی کے بعد دی گئی تو ایسے شخص کو حدیث کے الفاظ میں "تیس مستعار" یعنی کرایہ کا سانڈ سمجھئے، بہرحال دونوں ہی صورتوں میں یہ نکاح و طلاق کا ڈراما شریعت الٰہی کے ساتھ ایک مذاق ہوا۔ اس آیت میں ہمیں جو تعلیم دی گئی ہے وہ یہ ہے کہ عورت فی الواقع زندگی بھر کے نباہ کے ارادہ کے ساتھ کسی دوسرے شوہر کے حبالہ عقد میں داخل ہو اور یہ دوسرا شوہر اسی طرح کی کسی مجبوری کے تحت اس کو طلاق دے جس طرح کی مجبوریوں میں کوئی شخص اپنی بیوی کو طلاق دیتا ہے۔ اگر یہ صورت ہوگی تو بلاشبہ یہ عورت

اپنے پہلے شوہر کے ساتھ نکاح کر سکتی ہے۔ لیکن اگر اس نکاح و طلاق میں کسی سازش کو دخل ہے تو یہ نکاح و طلاق اور اس کے سارے شرکاء عند اللہ ملعون و مغضوب ہیں اس سے کچھ بحث نہیں کہ یہ سب کچھ وطی کے بعد ہوا ہے یا وطی کے بغیر۔

یہ مسئلہ درحقیقت پیدا ایک حدیث کی بنا پر ہوا ہے، قرآن سے اس کیلئے استدلال تو محض ایک نکتہ بعد الوقوع ہے، لیکن ہمارے نزدیک حدیث سے جو استدلال کیا گیا ہے وہ بھی نہایت کمزور ہے۔ حدیث کے مختلف طریقوں کو جمع کر کے جو نتیجہ سامنے آتا ہے ہم نے دیکھا ہے کہ وہ قرآن کے بالکل موافق ہے۔ اگر ہم نے اپنی اس کتاب میں فقہی مباحث کے لئے ایک خاص حد نہ مقرر کر لی ہوتی تو ہم اس حدیث پر بھی تفصیل کے ساتھ بحث کر کے دکھاتے کہ اصل حقیقت کیا بیان ہوئی ہے اور لوگوں نے اس کو کیا بنا دیا ہے لیکن یہ بحث ہمارے دائرہ سے باہر ہے۔

آگے فرمایا کہ دوسرے شوہر سے طلاق مل جانے کے بعد اس بات میں کوئی حرج نہیں ہے کہ دونوں سابق میاں بیوی آپس میں پھر رشتہ ازدواج میں منسلک ہو جائیں بشرطیکہ یہ توقع رکھتے ہوں کہ وہ اللہ کے حدود کو قائم رکھ سکیں گے۔ اس تنبیہ کی ضرورت اس لئے ہوئی کہ نکاح و طلاق بہرحال بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ یہ جب بھی عمل میں آئے، سچے ارادے اور سازگاری کی مخلصانہ خواہش کے ساتھ ہی عمل میں آئے۔

آخر میں فرمایا کہ اللہ نے اپنی مقرر کی ہوئی حدوں کو اچھی طرح لوگوں کے لئے واضح کر دیا ہے تو جو لوگ حدود الٰہی کے علم کے طالب ہیں ان کی قدر کریں اور ان کی خلاف ورزی کے نتائج سے بچیں۔ یعلمون کا ترجمہ ہم نے "جو لوگ علم کے طالب ہیں" کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عربی میں فعل کے استعمالات کے مواقع پر غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ فعل جس طرح اپنے ظاہری یا ابتدائی معنی کے لئے آتا ہے یا جس طرح اپنے کامل اور حقیقی معنی کے لئے آتا ہے اسی طرح ارادہ فعل اور طلب فعل کیلئے بھی آتا ہے اور امتیاز ان کے درمیان موقع کلام اور سیاق و سباق سے ہوتا ہے۔

وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَأَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ أَوْ سَرِّحُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ ص وَلَا تُمْسِكُوهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوا ۚ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ ۚ وَلَا تَتَّخِذُوا آيَاتِ اللَّهِ هُزُوًا ۚ وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ

عَلَيْكُمْ وَمَآ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهٖ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝ ۲۳۱۔

ایک مطلقہ کے لئے انتظار کی جو مدت شریعت نے مقرر کی ہے وہ آیت ۲۲۸ میں بتادی گئی ہے اور آیت ۲۲۹ میں طلاق کا صحیح طریقہ بھی بتادیا گیا ہے اور یہ بھی واضح کر دیا گیا ہے کہ تیسرے طہر میں یا تو دستور کے مطابق بیوی سے ازدواجی تعلقات بحال کر لو اور اگر یہ منظور نہ ہو تو پھر حسن و خوبی کے ساتھ اس کو رخصت کر دو۔ اب اس آیت میں اس امر کی مزید وضاحت فرمادی کہ "دستور کے مطابق روکنے" سے شریعت کا کیا منشا ہے؟ اس منشا کی وضاحت یوں فرمائی کہ یہ روکنا ہرگز ہرگز اس ارادے کے ساتھ نہ ہو کہ اس طرح بیوی تمہارے پنجہ ستم میں اسیر رہے اور تم اس کو اپنی خواہش کے مطابق اذیت پہنچا سکو۔ مثبت پہلو سے بات اُوپر کہہ چکنے کے بعد منفی پہلو سے بھی اس کی وضاحت اس لئے کر دی گئی کہ ظالم لوگ طلاق اور طلاق کے بعد مراجعت کے شوہری حق کو اس ظلم کے لئے استعمال کر سکتے تھے حالانکہ یہ صریح اعتداء یعنی اللہ کے حدود سے تجاوز اور اس کی شریعت کو مذاق بنانا ہے۔ فرمایا کہ جو لوگ ایسی جسارت کرتے ہیں بظاہر تو وہ ایک عورت کو نشانہ ظلم بناتے ہیں لیکن حقیقت میں وہ سب سے بڑا ظلم اپنی جان پر کرتے ہیں کیونکہ اللہ کے حدود کو پھاندنے اور اس کی شریعت کو مذاق بنانے کی سزا بڑی ہی سخت ہے۔

آخر میں فرمایا کہ اللہ کے اس احسان کو یاد رکھو کہ اس نے تمہیں ایک برگزیدہ اُمت کے منصب پر سرفراز فرمایا، تمہاری ہدایت کے لئے تمہارے اندر اپنا نبی بھیجا، تمہیں خیر و شر اور نیک و بد سے آگاہ کرنے کے لئے تمہارے اُوپر اپنی کتاب اتاری جو قانون اور حکمت دونوں کا مجموعہ ہے۔ اللہ کی ایسی عظیم نعمتیں پانے کے بعد اگر تم نے ان کا یہی حق ادا کیا کہ خدا کے حدود کو توڑا اور اس کی شریعت کو مذاق بنایا تو سوچ لو کہ ایسے لوگوں کا انجام کیا ہو سکتا ہے! پھر فرمایا کہ اللہ سے ڈرتے رہو، اور خوب جان رکھو کہ وہ تمہاری ہر بات سے باخبر ہے، یعنی وہ لوگوں کی شرارتوں کے باوجود ان کو ڈھیل تو دیتا ہے لیکن جب وہ پکڑے گا تو اس کی پکڑ سے کوئی بھی چھوٹ نہ سکے گا۔

یہاں یہ نکتہ بھی ملحوظ رہے کہ شریعت کو مذاق بنانے سے صرف یہ مطلب نہیں ہے کہ اس کا کھلم کھلا مذاق اُڑایا جائے۔ بلکہ اس کی ایک نہایت سنگین شکل یہ بھی ہے کہ ظاہری اعتبار سے تو کام ایسا

کیا جائے کہ اس پر کوئی اعتراض نہ کیا جا سکے لیکن مقصد و منشا کے لحاظ سے وہ کام شریعت کے مقصد کے بالکل خلاف ہو۔ مثلاً تیسرے طہر میں اگر کوئی شخص اپنی بیوی سے مراجعت کرلے تو از روئے شریعت اس کو اس کا حق تو حاصل ہے لیکن اگر اس سے اس کا مقصد بیوی کو تنگ کرنا ہو تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس نے اللہ کی آیات کے پردے میں اللہ ہی کی مخالفت کی۔ ظاہر ہے کہ یہ اللہ اور اس کی شریعت کے ساتھ صریح مذاق ہے۔

۷۶۔ آگے کا مضمون (۲۳۲-۲۳۷)

نکاح و طلاق سے متعلق جو مضمون اُوپر بیان ہوا اسی سلسلے کی مزید ہدایات آگے بیان ہو رہی ہیں:۔

وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوهُنَّ أَن يَنكِحْنَ أَزْوَاجَهُنَّ إِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُم بِالْمَعْرُوفِ ۗ ذَٰلِكَ يُوعَظُ بِهِ مَن كَانَ مِنكُمْ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۗ ذَٰلِكُمْ أَزْكَىٰ لَكُمْ وَأَطْهَرُ ۚ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ﴿٢٣٢﴾ وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ ۖ لِمَنْ أَرَادَ أَن يُتِمَّ الرَّضَاعَةَ ۚ وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ ۚ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ إِلَّا وُسْعَهَا ۚ لَا تُضَارَّ وَالِدَةٌ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُودٌ لَّهُ بِوَلَدِهِ ۚ وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذَٰلِكَ ۗ فَإِنْ أَرَادَا فِصَالًا عَن تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا ۗ وَإِنْ أَرَدتُّمْ أَن تَسْتَرْضِعُوا أَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ ﴿٢٣٣﴾ إِذَا سَلَّمْتُم مَّا آتَيْتُم بِالْمَعْرُوفِ ۗ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿٢٣٤﴾ وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنكُمْ وَيَذَرُونَ أَزْوَاجًا يَتَرَبَّصْنَ بِأَنفُسِهِنَّ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَعَشْرًا ۖ فَإِذَا بَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا فَعَلْنَ فِي أَنفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ ۗ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ﴿٢٣٥﴾ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا عَرَّضْتُم بِهِ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَاءِ أَوْ أَكْنَنتُمْ فِي أَنفُسِكُمْ ۚ عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ سَتَذْكُرُونَهُنَّ وَلَٰكِن لَّا تُوَاعِدُوهُنَّ سِرًّا إِلَّا أَن تَقُولُوا قَوْلًا مَّعْرُوفًا ۚ وَلَا تَعْزِمُوا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتَّىٰ يَبْلُغَ الْكِتَابُ أَجَلَهُ ۚ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا فِي أَنفُسِكُمْ فَاحْذَرُوهُ ۚ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ غَفُورٌ حَّلِيمٌ ﴿٢٣٥﴾

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ مَا لَمْ تَمَسُّوهُنَّ أَوْ تَفْرِضُوا لَهُنَّ فَرِيضَةً ۖ وَّ
مَتِّعُوهُنَّ ۚ عَلَى الْمُوسِعِ قَدَرُهُ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهُ ۚ مَتَاعًا بِالْمَعْرُوفِ ۖ حَقًّا عَلَى
الْمُحْسِنِينَ ﴿٢٣٦﴾ وَإِنْ طَلَّقْتُمُوهُنَّ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَمَسُّوهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيضَةً
فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ إِلَّا أَنْ يَعْفُونَ أَوْ يَعْفُوَ الَّذِي بِيَدِهِ عُقْدَةُ النِّكَاحِ ۚ وَأَنْ تَعْفُوا
أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ ۚ وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿٢٣٧﴾

اور جب تم عورتوں کو طلاق دے چکو اور وہ اپنی عدت پوری کر چکیں تو تم اس بات میں مزاحم نہ بنو کہ وہ اپنے ہونے والے شوہروں سے نکاح کریں جب کہ وہ آپس میں معاملہ دستور کے مطابق طے کریں۔ یہ نصیحت تم میں سے ان لوگوں کو کی جاتی ہے جو اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں۔ یہی تمہارے لئے زیادہ پاکیزہ اور ستھرا طریقہ ہے، اللہ جانتا ہے، تم نہیں جانتے۔۲۳۲۔

اور مائیں اپنے بچوں کو ان لوگوں کے لئے پورے دو سال دودھ پلائیں جو پوری مدت دودھ پلوانا چاہتے ہوں۔ اور بچے والے کے ذمہ بچوں کی ماؤں کا دستور کے مطابق کھانا اور کپڑا ہے۔ کسی پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہ ڈالا جائے۔ نہ کسی ماں کو اس کے بچے کے سبب سے نقصان پہنچایا جائے اور نہ کسی باپ کو اس کے بچے کے سبب سے۔ اور اسی طرح کی ذمہ داری وارث پر بھی ہے۔ پھر اگر دونوں باہمی رضامندی اور صلاح سے دودھ چھڑا دینا چاہیں تو دونوں پر کوئی گناہ نہیں۔ اور اگر تم اپنے بچوں کو کسی اور سے دودھ پلوانا چاہو تو اس میں کوئی ہرج نہیں، جب کہ تم ان کو دستور کے مطابق وہ ادا کر دو جو تم نے دینے کا وعدہ کیا ہے اور اللہ سے ڈرتے رہو اور جان رکھو کہ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس کو دیکھ رہا ہے۔۲۳۳۔

اور جو تم میں سے وفات پا جائیں اور بیویاں چھوڑ جائیں تو وہ بیویاں اپنے بارے میں چار ماہ دس دن توقف کریں پھر جب وہ اپنی مدت کو پہنچ جائیں تو جو کچھ وہ اپنے بارے میں دستور کے مطابق کریں اس کا تم پر کوئی گناہ نہیں اور اللہ جو کچھ بھی تم کرتے ہو اس سے پوری طرح باخبر ہے۔ اور اس بات میں بھی کوئی گناہ نہیں جو تم ان عورتوں سے پیغامِ نکاح کے قسم کی بطریقِ کنایہ واشارہ کہو یا اپنے دلوں میں رکھو۔ اللہ کو معلوم ہے کہ تم ان سے ذکر کرو گے لیکن چپکے سے ان کے ساتھ نکاح کا قول وقرار نہ کر بیٹھو، ہاں دستور کے مطابق کوئی بات

کہہ سکتے ہو۔ اور عقد نکاح کا عزم اس وقت تک نہ کرو جب تک قانون اپنی مدت کو نہ پہنچ جائے اور جان رکھو کہ اللہ جانتا ہے جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے تو اس سے ڈرتے رہو اور جان رکھو کہ اللہ بخشنے والا اور بردبار ہے۔ ۲۳۴-۲۳۵۔

اور اگر تم عورتوں کو اس صورت میں طلاق دو کہ نہ ان کو ہاتھ لگایا ہو اور نہ ان کے لئے متعین مہر مقرر کیا ہو تو ان کے مہر کے باب میں تم پر کوئی گناہ نہیں۔ البتہ ان کو دستور کے مطابق دے دلا کر رخصت کرو، صاحب وسعت اپنی وسعت کے مطابق اور غریب اپنی حالت کے مطابق، یہ بھلے لوگوں پر حق ہے۔ اور اگر تم نے ان کو طلاق تو دی ان کو ہاتھ لگانے سے پہلے لیکن ایک متعین مہر ٹھہرا چکے ہو تو مقررہ مہر کا آدھا ادا کرو الا آنکہ وہ اپنا حق چھوڑیں یا وہ اپنا حق چھوڑے جس کے ہاتھ میں سررشتہ نکاح ہے اور یہ کہ تم اپنا حق معاف کرو، یہ تقویٰ سے زیادہ قریب ہے۔ اور تمہارے درمیان ایک کو دوسرے پر جو فضیلت ہے اس کو نہ بھولو۔ جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اس کو دیکھ رہا ہے۔ ۲۳۶-۲۳۷۔

۷۷۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ ذٰلِكَ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ وَاَطْهَرُ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۲۳۲

"عضل" کے معنی روکاوٹ پیدا کرنے اور اڑنگے ڈالنے کے ہیں اور ازواجہن میں ازواج سے مراد ان کے وہ ہونے والے شوہر ہیں جن سے آئندہ وہ نکاح کرنے کی خواہشمند ہیں۔

جو عورت طلاق پاکر اپنی عدت پوری کر چکی ہو وہ آزاد ہے کہ جہاں پسند کرے نکاح کرے۔ اس کے اس ارادے میں طلاق دینے والے شوہر یا اس کے خاندان والوں کو کوئی رکاوٹ نہیں پیدا کرنی چاہیئے۔ عام اس سے کہ یہ رکاوٹ صریح ممانعت کے قسم کی ہو یا اندرونی سازش اور جوڑ توڑ کی نوعیت کی۔ بعض خاندانوں اور برادریوں میں یہ جہالت پائی جاتی ہے کہ اگر ان کے اندر کوئی عورت بیاہی

جا چکی ہو تو اس کے طلاق پا جانے یا اس کے شوہر کے وفات پا جانے کے بعد بھی یہ لوگ برداشت نہیں کرتے کہ ایسی عورت کہیں اور نکاح کرے، اس میں وہ اپنی توہین خیال کرتے ہیں اور طرح طرح کے اڑنگے اس کے راستے میں ڈالتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس کے سبب سے بسا اوقات قتل و فساد کے نہایت سنگین حادثے ہو جاتے ہیں۔ جس طرح یہ جہالت ہمارے ملک میں پائی جاتی ہے، اسی طرح عرب میں بھی پائی جاتی تھی۔ قرآن نے اس سے روکا کہ جس نے ایک عورت کو طلاق دے چھوڑی اب اسے اس کی راہ میں روکاوٹ بننے کا کوئی حق نہیں رہا، وہ جہاں چاہے اور جس کے ساتھ اس کا معاملہ طے پا جائے اگر معاملہ دستور کے مطابق طے پایا ہے تو اس پر کسی کو اعتراض کا حق نہیں ہے۔

"دستور کے مطابق" سے مراد یہاں عرب کے شرفاء کا وہ رواج و دستور ہے جس کو اسلام نے بُرے رواجوں سے پاک کر کے اسلامی شریعت کا جزو بنا لیا تھا اور بہت سے معاملات میں لوگوں کو انہی پر عمل کرنے کی یا تو ہدایت کی یا ان پر عمل کی آزادی دے دی۔ یہاں معاملہ طے کرنے کیلئے معروف کی جو شرط لگائی ہے تو اس سے مقصود یہ ہے کہ عورت اور مرد دونوں کے لئے یہ ضروری ہے کہ معاملہ طے کرنے میں کوئی ایسی بات نہ کریں جو شریف خاندانوں کی روایات کے خلاف ہو اور جس سے سابق شوہر یا ہونے والے شوہر یا خود عورت کے خاندان کی عزت و شہرت کو بٹہ لگنے کا اندیشہ ہو۔

فرمایا کہ یہ نصیحتیں ان لوگوں کو کی جا رہی ہیں جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، یعنی جن لوگوں کے اندر خدا اور آخرت پر ایمان موجود ہے، ان کے ایمان کا یہ لازمی تقاضا ہے کہ وہ ان نصیحتوں پر عمل کریں۔ پھر فرمایا کہ یہ تمہارے لئے زیادہ پاکیزہ اور ستھرا طریقہ ہے۔ یعنی اگر عورت کی حسب مرضی نکاح کی راہ میں رکاوٹ پیدا کی گئی تو اس سے خاندان اور پھر معاشرے میں بہت سی بُرائیاں پھیلنے کے اندیشے ہیں۔ یہیں سے خفیہ روابط، پھر زنا، پھر اغوا اور فرار کے بہت سے چور دروازے پیدا ہوتے ہیں اور ایک فن ان سب کی ناک کٹ کے رہتی ہے جو ناک ہی اونچی رکھنے کے زعم میں فطری جذبات کے مقابل میں بیہودہ رسوم کی رکاوٹیں کھڑی کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ آخر میں فرمایا کہ "اللہ جانتا ہے، تم نہیں جانتے" یعنی تمہارا علم اور تمہاری نظر بہت محدود ہے، تمہارے لئے زندگی کے تمام نشیب و فراز کو سمجھ لینا بڑا مشکل ہے اس وجہ سے جو کچھ تمہیں خدا کی طرف سے حکم دیا جا رہا ہے اس پر عمل کرو۔

وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ أَرَادَ أَنْ يُتِمَّ الرَّضَاعَةَ

وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ إِلَّا وُسْعَهَا لَا تُضَارَّ وَالِدَةٌ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُودٌ لَّهُ بِوَلَدِهِ وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذَٰلِكَ فَإِنْ أَرَادَا فِصَالًا عَن تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا وَإِنْ أَرَدتُّمْ أَن تَسْتَرْضِعُوا أَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِذَا سَلَّمْتُم مَّا آتَيْتُم بِالْمَعْرُوفِ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ۝ ۲۳۳ -

اس آیت میں رضاعت سے متعلق اکٹھے بہت سے مسائل بیان ہوگئے ہیں جو بالترتیب یہ ہیں -

۱ - مطلقہ پر اپنے بچے کو پورے دو سال دودھ پلانے کی ذمہ داری ہے اگر طلاق دینے والا شوہر یہ چاہتا ہے کہ عورت یہ رضاعت کی مدت پوری کرے -

۲ - اس مدت میں بچے کے باپ پر مطلقہ کے کھانے کپڑے کی ذمہ داری ہے اور اس معاملہ میں دستور کا لحاظ ہوگا یعنی شوہر کی حیثیت، عورت کی ضروریات، اور مقام کے حالات پیش نظر رکھ کر فریقین فیصلہ کریں گے کہ عورت کو نان نفقہ کے طور پر کیا دیا جائے -

۳ - فریقین میں سے کسی پر بھی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالا جائے گا، نہ بچے کے بہانے سے ماں کو کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش کی جائے گی اور نہ بچے کی آڑ لے کر باپ پر کوئی ناروا دباؤ ڈالا جائے گا -

۴ - اگر بچے کا باپ وفات پا چکا ہو تو بعینہٖ یہی پوزیشن مذکورہ ذمہ داریوں اور حقوق کے معاملے میں اس کے وارث کی ہوگی -

۵ - اگر باہمی رضامندی اور مشورہ سے دو سال کی مدت کے اندر ہی اندر بچے کا دودھ چھڑا دینے کا عورت و مرد فیصلہ کر لیں تو وہ ایسا کر سکتے ہیں -

۶ - اگر باپ یا بچے کے ورثہ بچے کی والدہ کی جگہ کسی اور عورت سے دودھ پلوانا چاہتے ہیں تو وہ ایسا کرنے کے مجاز ہیں بشرطیکہ بچے کی والدہ سے دینے دلانے کی جو قرار داد ہوئی ہے وہ پوری کر دی جائے -

آخر میں یہ تنبیہ ہے کہ اللہ سے ڈرتے رہو اور یہ جان رکھو کہ جو کچھ تم کرتے ہو سب خدا کے سامنے کرتے ہو کوئی چیز اس سے مخفی نہیں رہتی -

مذکورہ بالا معاملات عام حالات میں تو عورت اور مرد اور متعلقہ خاندانوں کے ذمہ داروں کے خود طے کر لینے کے ہیں لیکن اگر کوئی نزاع پیدا ہو جائے تو انہی اصولوں کو پیش نظر رکھ کر پنچائتیں اور عدالتیں فیصلہ کر دیں گی۔

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۲۳۴

اگر کسی عورت کے شوہر کی وفات ہو جائے تو ایسی عورت کی عدت چار ماہ دس دن ہے (اور حاملہ ہونے کی صورت میں وضع حمل) عام مطلقہ کی نسبت سے بیوہ کی عدت میں یہ اضافہ استبراء رحم، عورت کی سہولت اور سوگ وغیرہ کی مختلف مصلحتوں سے ہے۔ عورت کمزور فریق، نازک دل اور شدید الاحساس ہونے کی وجہ سے شوہر کے صدمہ کو محسوس بھی زیادہ کرتی ہے اور حالت بیوگی میں وہ ہمدردی کی محتاج بھی بہت زیادہ ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے اس کا زمانہ عدت زیادہ رکھا گیا ہے تاکہ شوہر کی وفات کے صدمہ کے ساتھ ساتھ معاً اس کو شوہر کی ڈیوڑھی چھوڑنے کا صدمہ بھی نہ اُٹھانا پڑ جائے۔ چنانچہ اسی مصلحت کے تحت آگے اسی آیت کی مزید توضیح کے طور پر ایک عارضی ہدایت یہ بھی ہوئی کہ وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا، وَصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ ، فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوْفٍ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۲۴۰ - بقرہ (اور جو تم میں سے وفات پائیں اور بیویاں چھوڑ رہے ہوں، وہ اپنی بیویوں کے لئے وصیت کر جائیں کہ انہیں گھر سے نکالے بغیر ایک سال تک نان نفقہ دیا جائے۔ اور اگر وہ خود نکلیں تو جو کچھ وہ اپنے معاملے میں دستور کے مطابق کریں اس میں تم پر کوئی الزام نہیں، اللہ غالب اور حکیم ہے)

مذکورہ عدت گزار چکنے کے بعد وہ آزاد ہیں کہ اپنے معاملہ میں دستور کے مطابق جو قدم مناسب خیال کریں اُٹھائیں۔ اس کے بعد نہ اولیاء پر کوئی الزام ہے اور نہ انہی پر کوئی الزام ہے، اگر انہوں نے معروف کی کوئی خلاف ورزی نہیں کی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ غیر شرعی رسوم کو شریعت کا درجہ دے کر خواہ مخواہ ایک دوسرے کو مورد طعن و الزام نہیں بنانا چاہیئے۔ نہ شوہر کے وارثوں اور عورت

کے اولیاء کو یہ طعنہ دینا چاہیئے کہ عورت اپنے شوہر کا پورا سوگ بھی نہ منا چکی کہ وہ اس سے تنگ آ گئے اور نہ عورت کو یہ طعنہ دینا چاہیئے کہ ابھی شوہر کا کفن بھی میلا نہ ہونے پایا تھا کہ یہ شادی رچانے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ خدا نے جو حدود مقرر کر دیئے ہیں بس انہی کی پابندی کرنی چاہیئے اور اس بات کو یاد رکھنا چاہیئے کہ اللہ بندوں کے ہر عمل سے باخبر ہے۔

عورت کے لئے معروف کی پابندی کی جو شرط لگائی ہے اس سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ نکاح کے معاملے میں کفو کا بھی لحاظ ہونا چاہیئے تاکہ متعلق خاندانوں کی وجاہت کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔

وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا عَرَّضْتُمْ بِهِ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَاءِ أَوْ أَكْنَنتُمْ فِي أَنفُسِكُمْ ۚ عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ سَتَذْكُرُونَهُنَّ وَلَٰكِن لَّا تُوَاعِدُوهُنَّ سِرًّا إِلَّا أَن تَقُولُوا قَوْلًا مَّعْرُوفًا ۚ وَلَا تَعْزِمُوا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتَّىٰ يَبْلُغَ الْكِتَابُ أَجَلَهُ ۚ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا فِي أَنفُسِكُمْ فَاحْذَرُوهُ ۚ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ غَفُورٌ حَلِيمٌ ۲۳۵

اسلامی معاشرے میں ایک دوسرے کے جذبات کے لحاظ و احترام کی بڑی اہمیت ہے۔ اس وجہ سے ممانعت فرمائی کہ اگر کوئی انتقال کر جائے تو کسی کے لئے یہ بات جائز نہیں ہے کہ وہ اس کی بیوہ سے اس کے زمانہ عدت ہی میں نکاح کی پینگیں بڑھانا شروع کر دے۔ اپنے ایک مرحوم بھائی کے لئے ایک حساس اور دردمند بھائی کے اندر جو جذبات ہونے چاہئیں، یہ بات اس کے بھی منافی ہے اور ایک غمزدہ بیوہ کے جذبات کا ایک شریف آدمی کو جو لحاظ ہونا چاہیئے یہ اس کے بھی خلاف ہے۔ مسلمانوں کا معاشرہ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ کا معاشرہ ہے، جانوروں کا گلہ نہیں ہے فرمایا کہ اگر کوئی شخص بیوہ سے نکاح کا طالب ہو تو وہ یہ تو کر سکتا ہے کہ کوئی کلمہ بطور اشارہ زبان سے نکال دے یا اپنے دل میں نکاح کا ارادہ کرے لیکن یہ جائز نہیں ہے کہ پوشیدہ طور پر نکاح کا قول و قرار کر لے۔ بس تعزیت و ہمدردی تک بات محدود رہنی چاہیئے جو اس طرح کے حالات کے لئے معروف ہے، اگر اس ہمدردی کے سلسلہ میں کوئی کلمہ ایسا تراوش کر جائے جو کوئی غمازی کر دے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔

عَلِمَ اللّٰہُ اَنَّکُمْ سَتَذْکُرُوْنَھُنَّ۔ بطور جملہ معترضہ ہے اور مقصود اس سے تنبیہ ہے کہ دلوں کے مخفی ارادوں کے متعلق یہ گمان نہ رکھو کہ یہ خدا سے مخفی رہتے ہیں۔ خدا خوب جانتا ہے کہ تم اس ارادے

کو ظاہر کرو گے، سو ظاہر کرو تو اس طرح نہ کرو کہ وہ قول و قرار اور عہد و پیمان کی شکل اختیار کرلے بلکہ اسی انداز میں ہو جو اس طرح کے حالات کے لئے پسندیدہ اور دستور کے موافق ہے۔

کتاب کا لفظ ہم دوسری جگہ واضح کر چکے ہیں کہ قرآن میں کسی متعین شرعی قانون کے لئے بھی استعمال ہوا ہے۔ یہاں اس سے مراد چار ماہ دس دن کی عدت کا وہ قانون ہے جو ایک بیوہ کے لئے اوپر بیان ہو چکا ہے۔ کسی خاص قانون کو کتاب کے لفظ سے تعبیر کرنا اس کی اہمیت کو واضح کرتا ہے۔ فرمایا کہ جب تک قانون کی مدت پوری نہ ہو جائے اس وقت تک عقد نکاح کا عزم نہ کرو۔

اخیر میں اپنی صفت علم کا حوالہ دیا جس کی یادداشت ہی پر خدا کے قوانین کا صحیح احترام مبنی ہے۔ اور ساتھ ہی فرمایا کہ خدا سے ڈرتے رہو، اس کی ڈھیل سے دھوکے میں نہ پڑو، وہ غفور اور بردبار ہے اس وجہ سے درگزر کرتا ہے لیکن کوئی چیز اس کے علم سے باہر نہیں ہے۔

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَا لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ اَوْ تَفْرِضُوْا لَهُنَّ فَرِيْضَةً وَّمَتِّعُوْهُنَّ عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ مَتَاعًا بِالْمَعْرُوْفِ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ ۝ ۲۳۶

اس آیت میں "لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ" کا تعلق ایک محذوف سے ہے۔ پوری بات یوں ہے کہ اگر صورت یہ ہو کہ ایک شخص اپنی منکوحہ کو اس حال میں طلاق دے کہ نہ اس نے ابھی اس کے ساتھ تعلق زن و شو قائم کیا ہو نہ اس کے لئے مہر ہی معین کیا ہو تو ایسی صورت میں در باب مہر اس پر کوئی گناہ نہیں بلکہ مہر کے بجائے اسے چاہیئے کہ وہ دستور کے مطابق اس کو کچھ دے دلا کر رخصت کرے۔ دستور کے موافق سے مراد یہ ہے کہ اس کے لئے کوئی حد معین نہیں ہے بلکہ اس کا انحصار آدمی کے معیار زندگی پر ہے۔ ایک غریب اپنی وسعت کے مطابق دے، امیر اپنی وسعت کے مطابق۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ جو لوگ اپنی زندگی بنانے اور سنوارنے کے خواہش مند ہیں اور اہل احسان کے زمرے میں شامل ہونا چاہتے ہیں ان پر یہ ایک حق ہے۔

وَاِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ اِلَّآ اَنْ يَّعْفُوْنَ اَوْ يَعْفُوَا الَّذِيْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ وَاَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ

بَصِیْرٌ ۝ ۲۳۷ -

یہ اُوپر کی صورت سے ایک مختلف صورت بیان ہو رہی ہے - وہ یہ کہ مہر تو طے شدہ ہے لیکن طلاق ملاقات سے پہلے ہی دے دی گئی - ایسی صورت میں مقررہ مہر کا نصف دینا ہوگا - البتہ عورت اگر اپنا حق چھوڑ دے تو الگ بات ہے یا مرد اپنا حق چھوڑ دے یعنی نصف کے بجائے پورا مہر ادا کر دے - اگرچہ ایک محرک عورت کے لئے بھی مہر چھوڑنے کا موجود ہے کہ شوہر نے ملاقات سے پہلے ہی طلاق دی ہے لیکن قرآن نے مرد کو اکسایا ہے کہ اس کی فتوت اور مردانہ بلند حوصلگی اور اس کے درجے مرتبے کا تقاضا یہ ہے کہ وہ عورت سے اپنے حق کی دستبرداری کا خواہشمند نہ ہو بلکہ اس میدان ایثار میں خود آگے بڑھے - اس ایثار کے لئے قرآن نے یہاں مرد کو تین پہلوؤں سے اُبھارا ہے - ایک تو یہ کہ مرد کو خدا نے یہ فضیلت بخشی ہے کہ وہ نکاح کی گرہ کو جس طرح باندھنے کا اختیار رکھتا ہے اسی طرح اس کو کھولنے کا بھی مجاز ہے، دوسرا یہ کہ ایثار و قربانی جو تقویٰ کے اعلیٰ ترین اوصاف میں سے ہے وہ جنس ضعیف کے مقابل میں جنس قوی کے شایان شان زیادہ ہے، تیسرا یہ کہ مرد کو خدا نے اس کی صلاحیتوں کے اعتبار سے عورت پر جو ایک درجہ ترجیح کا بخشا ہے اور جس کے سبب سے اس کو عورت کا قوام اور سربراہ بنایا ہے یہ ایک بہت بڑی فضیلت ہے جس کو عورت کے ساتھ کوئی معاملہ کرتے وقت مرد کو بھولنا نہیں چاہئے، اس فضیلت کا فطری تقاضا یہ ہے کہ مرد عورت سے لینے والا نہیں بلکہ اس کو دینے والا بنے -

یہاں "بِیَدِہٖ عُقْدَۃُ النِّکَاحِ" کے الفاظ میں ایک اور نکتہ بھی ہے جو اس دور کے معاشرتی مفکروں اور مصلحوں کو خاص طور پر نگاہ میں رکھنا چاہیئے - وہ یہ کہ نکاح کی گرہ جس طرح مرد کے قبول سے بندھتی ہے اسی طرح اسی کی طلاق سے کھلتی ہے، گویا یہ سررشتہ اصلاً شریعت نے مرد ہی کے اختیار میں رکھا ہے اس وجہ سے طلاق کے معاملے میں عورت کو مرد کے مساوی اختیار دینے کا رجحان جو مغرب کی نقالی میں، ہمارے مسلمان ممالک میں بڑھتا جا رہا ہے، شریعت کے بالکل خلاف ہے اور اس سے خاندانی نظام کا شیرازہ بالکل پراگندہ ہو کر رہ جائے گا -

۷۸ - آگے کا مضمون آیات (۲۳۸-۲۴۲)

احکام و قوانین کا باب جو آیت ۱۶۳ سے توحید اور اس کے بعد نماز اور زکوٰۃ کے ذکر سے

شروع ہوا تھا اب ان آیات پر ختم ہو رہا ہے۔ اس مجموعہ آیات کی ترتیب اس طرح ہے کہ ایک آیت جو اصل خاتمۂ باب کی حیثیت رکھتی ہے خوف اور امن ہر طرح کے حالات میں نمازوں کی حفاظت سے متعلق ہے اور دو آیتوں میں بیوہ اور مطلقہ سے متعلق جن کا ذکر اوپر کی آیات میں ہوا تھا، بعض ضمنی ہدایات ہیں جو بعد میں نازل ہوئیں۔ یہ دونوں آیتیں خاتمۂ باب کے ساتھ ملحق کر دی گئیں تاکہ کلام میں ان کی ترتیب ہی سے واضح ہو جائے کہ یہ آیات اصل احکام کے بعد بطور وضاحت نازل ہوئی ہیں چنانچہ ان کے ساتھ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ کا ٹکڑا لگا کر ان کے توضیحی آیات ہونے کی طرف اشارہ بھی فرما دیا تاکہ نظم کلام کے طالب کو ربط کلام کے سمجھنے میں کوئی زحمت نہ پیش آئے۔

گویا خاتمۂ باب کی اصل آیت حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى والی آیت ہے۔ اب اس باب کے آغاز پر نظر ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ اس کے آغاز میں توحید کے ذکر کے بعد احکام شریعت کے سلسلہ میں سب سے پہلے آیت ۴۳ میں نماز اور ساتھ ہی زکوٰۃ کا ذکر آتا ہے۔ یہاں دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ اس باب کا خاتمہ بھی نماز ہی کے ذکر پر ہوا ہے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس دین میں جو اہمیت نماز کی ہے وہ دوسری کسی چیز کی بھی نہیں ہے، ساری شریعت کا قیام و بقا اسی کے قیام و بقا پر منحصر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو شریعت کی اقامت اور اس کی محافظت کے لئے ایک حصار اور باڑھ کی حیثیت دی ہے۔ جو شخص اس کی حفاظت کرتا ہے وہ گویا پوری شریعت کی حفاظت کرتا ہے اور جو شخص اس میں رخنے پیدا کر دیتا ہے وہ، جیسا کہ حضرت عمرؓ سے منقول ہے، باقی دین کو بدرجہا دانی ضائع کر دیتا ہے۔

یہاں یہ نکتہ بھی ملحوظ رہے کہ شروع باب میں جس نماز کا ذکر ہے وہ امن و اطمینان کے حالات کی پنجوقتہ معروف نماز ہے اور یہاں امن و اطمینان کی نماز کے علاوہ خوف و خطرے کی نماز کا بھی ذکر ہے۔ یہ نماز کے احکام کے بیان میں حالات کی تبدیلی کے ساتھ ایک تدریجی ارتقا ہوا ہے جس وقت باب کے آغاز کی آیتیں نازل ہوئی ہیں جنگ و جہاد کے حالات نہیں تھے لیکن تحویل قبلہ کے بعد سے آپ نے پڑھا کہ جنگ و جہاد کے احکام نہایت تفصیل سے بیان ہوئے ہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اصلی سلسلہ کلام جو چل رہا تھا وہ تو جہاد اور انفاق ہی کا تھا، دوسرے مسائل

تو، جیسا کہ ہم اُوپر اشارہ کر آئے ہیں، ضمناً پیدا ہو گئے ہیں۔ حالات کی یہ تبدیلی متقاضی ہوئی کہ امن کی نماز کے ساتھ خوف اور خطرے کی نماز کا بھی ذکر کر دیا جائے۔ چنانچہ پہلی صورت کی نماز کا ذکر اقامت صلوٰۃ کے لفظ سے کیا ہے اور اس دوسری حالت کی نماز کا ذکر محافظت علی الصلوات کے الفاظ سے فرمایا۔ بیان کے ان دونوں اسلوبوں میں شدت اہتمام کا جو فرق نمایاں ہے وہ اہل نظر سے مخفی نہیں ہو سکتا۔

یہ بات کہ نماز پورے دین کے لئے بمنزلہ حصار اور شہر پناہ ہے اگرچہ قرآن میں تدبر کرنے والوں سے مخفی نہیں ہو سکتی، اس کے شواہد و نظایر قرآن میں بہت ہیں، لیکن ممکن ہے ایک عام قاری کو یہ شبہہ ہو کہ یہاں ہم نے ربط کلام جوڑنے میں تکلف سے کام لیا ہے اس وجہ سے ہم سورۂ مومنون کا حوالہ دیتے ہیں جس میں اس ربط کلام کی نہایت واضح مثال موجود ہے۔ فرمایا ہے۔

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فَاعِلُوْنَ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حَافِظُوْنَ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعَادُوْنَ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُوْنَ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ

ان اہل ایمان نے فلاح پائی جو اپنی نمازوں میں خشوع کرنے والے ہیں، جو لغو سے مُنہ موڑنے والے ہیں، جو زکوٰۃ ادا کرنے والے ہیں، جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں، مگر اپنی بیویوں یا لونڈیوں سے، سو اس بارے میں ان کو کوئی ملامت نہیں، البتہ جو اس سے آگے بڑھے تو یہی لوگ حد سے بڑھنے والے ہیں، اور جو لوگ اپنی امانتوں اور اپنے عہد کا لحاظ کرنے والے ہیں اور جو اپنی نمازوں کی برابر نگہداشت رکھتے ہیں۔

(۱-۹ مومنون)

ان آیات پر غور کیجئے تو معلوم ہو گا کہ یہاں جو باتیں بیان ہوئی ہیں ان کا آغاز نماز سے ہوا ہے اور پھر دین و اخلاق کی چند بنیادی باتیں بیان کرنے کے بعد ان کا خاتمہ بھی نماز ہی پر ہوا ہے۔ علاوہ ازیں پہلی نماز کے ساتھ خشوع کا ذکر ہے جو نماز کی اصل روح ہے اور اس دوسری

نماز کے ساتھ محافظت کا حوالہ ہے جو اس کے تمام ظاہری اہتمام کی ایک جامع تعبیر بھی ہے اور جس سے یہ اشارہ بھی نکلتا ہے کہ درحقیقت نمازوں کی حفاظت ہی ہے جو دین کی دوسری باتوں کی حفاظت کی ضامن ہے۔

بالکل اسی طرح کا نظم سورہ معارج کی مندرجہ ذیل آیات میں بھی ہے۔

إِنَّ الْإِنسَانَ خُلِقَ هَلُوعًا ، إِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوعًا ، وَإِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوعًا ، إِلَّا الْمُصَلِّينَ الَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ صَلَاتِهِمْ دَائِمُونَ وَالَّذِينَ فِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُومٌ ، لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ ، وَالَّذِينَ يُصَدِّقُونَ بِيَوْمِ الدِّينِ وَالَّذِينَ هُم مِّنْ عَذَابِ رَبِّهِم مُّشْفِقُونَ ، إِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَيْرُ مَأْمُونٍ ، وَالَّذِينَ هُمْ لِفُرُوجِهِمْ حَافِظُونَ إِلَّا عَلَىٰ أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُومِينَ فَمَنِ ابْتَغَىٰ وَرَاءَ ذَٰلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْعَادُونَ وَالَّذِينَ هُمْ لِأَمَانَاتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُونَ ، وَالَّذِينَ هُم بِشَهَادَاتِهِمْ قَائِمُونَ ، وَالَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُونَ ○ (۱۹ - ۳۴-معارج)

بے شک انسان جلد باز پیدا ہوا ہے۔ جب اس کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے گھبرا اٹھتا ہے اور جب اس کو بھلائی پہنچتی ہے تو بخیل بن جاتا ہے۔ صرف وہ لوگ اس سے مستثنیٰ ہیں جو اپنی نمازوں پر قائم دوائم رہنے والے ہیں، جن کے مالوں میں سائلوں اور محرودموں کا ایک معین حق ہے، جو روز جزا کی تصدیق کرتے ہیں اور جو اپنے رب کے عذاب سے برابر ڈرتے رہنے والے ہیں۔ بے شک ان کے رب کا عذاب نچنت رہنے کی چیز نہیں۔ اور جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں مگر اپنی بیویوں اور لونڈیوں سے، سو ان کے باب میں ان کو کوئی ملامت نہیں البتہ جو اس حد سے آگے قدم بڑھائیں تو وہی لوگ حد سے تجاوز کرنے والے ہیں۔ اور جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کا پاس کرنے والے ہیں اور جو اپنی شہادتوں کے قائم کرنے والے ہیں اور جو اپنی نماز کی برابر نگہداشت رکھتے ہیں۔

یہاں بھی دیکھئے نماز ہی سے آغاز اور نماز ہی پر اختتام ہے۔ جس طرح ایک شہر پناہ پورے شہر کو اپنی حفاظت میں لئے ہوئے ہوتی ہے اسی طرح نماز دوسری تمام نیکیوں کو اپنی حفاظت

میں لئے ہوئے ہے اور مقصود اس سے، جیسا کہ اُوپر بیان ہوا، اس حقیقت کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ سارے دین کی محافظ نماز ہے جس نے اس کی حفاظت کی اس نے سارے دین کی حفاظت کی اور جس نے اس کو ضائع کیا اس نے سارے دین کو ضائع کیا۔

بالکل اسی اصول پر سورۂ بقرہ میں بھی اس پورے باب کو جو احکام و قوانین سے متعلق ہے آگے اور پیچھے دونوں طرف سے نماز کے حکم سے گھیر دیا ہے۔

اس روشنی میں اب آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ۚ وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ۝ ۲۳۸ فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا ۚ فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ۝ ۲۳۹ وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا ۙ وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ ۚ فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْ مَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوْفٍ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝ ۲۴۰ وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ۝ ۲۴۱ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝ ۲۴۲

نمازوں کی نگہداشت رکھو، خاص طور پر بیچ کی نماز کی اور نمازوں میں خدا کے حضور فرمانبردار کھڑے ہو۔ اگر خطرے کی حالت ہو تو پیدل یا سوار جس صورت میں ادا کر سکو نماز ادا کرو۔ پھر جب خطرہ دُور ہو جائے تو اللہ کو اس طریقہ پر یاد کرو جو اس نے تم کو سکھایا ہے، جس کو تم نہیں جانتے تھے۔ ۲۳۹۔

اور جو تم میں سے وفات پائیں اور بیویاں چھوڑ رہے ہوں وہ اپنی بیویوں کے لئے سال بھر کے نان نفقے کی گھر سے نکالے بغیر وصیت کر جائیں۔ اگر وہ خود گھر چھوڑیں تو جو کچھ وہ اپنے باب میں دستور کے مطابق کریں اس کا تم پر کوئی الزام نہیں اللہ عزیز و حکیم ہے۔

اور مطلقہ عورتوں کو بھی دستور کے مطابق کچھ دینا دلانا ہے، یہ خدا سے ڈرنے والوں پر حق ہے۔ ۲۴۰-۲۴۱

اسی طرح اللہ اپنی آیتوں کی تمہارے لئے وضاحت کرتا ہے تاکہ تم سمجھو۔ ۲۴۲

۷۹۔ الفاظ کی تحقیق اور جملوں کی وضاحت

حَافِظُوْا عَلَى الصَّلَوَاتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى وَ قُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ۝ ۲۳۸ نماز کی محافظت میں ان تمام چیزوں کی نگہداشت اور ان کا اہتمام شامل ہے جو اس کے لوازم و شرائط اور اس کے اداب وارکان سے تعلق رکھنے والی ہیں۔ اقامت صلوٰۃ کی وضاحت کرتے ہوئے ہم ان چیزوں کا ذکر کتاب کے شروع میں کر چکے ہیں۔ یہاں اقامت کی جگہ محافظت کا لفظ جس نئے پہلو کی طرف اشارہ کر رہا ہے وہ یہ ہے کہ مشکل اور پُرخطر حالات میں بھی، ہر طرح کے خطرات کا مقابلہ کر کے، اس کی حفاظت کی جائے۔ چنانچہ آگے والی آیت میں صلوٰۃ الخوف کا ذکر بھی ہے جس سے واضح ہے کہ تلواروں کی چھاؤں میں بھی جس چیز کو مومن نہیں بھولتا ہے، وہ یہی ہے۔

گو میں رہا رہینِ ستمہائے روزگار
لیکن تمہاری یاد سے غافل نہیں رہا

"الصلوٰۃ الوسطیٰ" کے لغوی معنی تو بیچ والی نماز کے ہیں اور اسلوب کلام صاف شہادت دے رہا ہے کہ یہ عام کے بعد خاص کا ذکر ہے۔ رہا یہ سوال کہ اس خاص سے کیا مراد ہے تو اس کے جواب میں اہل تاویل نے بڑا اختلاف کیا ہے۔ زیادہ لوگوں کی رائے یہ ہے کہ اس سے مراد عصر کی نماز ہے۔ ہمارا اپنا رجحان بھی اسی قول کی طرف ہے۔ یہ نماز ہماری شب و روز کی تقسیم میں ایک ایسی نماز کی حیثیت رکھتی ہے جو رات اور دن دونوں کی سرحد پر واقع ہو۔ سرحد پر تو کہہ سکتے ہیں کہ فجر کی نماز بھی واقع ہے لیکن جس سرحد پر عصر کی نماز واقع ہے وہ عام حالات میں بھی پرخطر ہے اور اگر حالات جنگ کے ہوں تب تو یہ بہت ہی پرخطر بن جاتی ہے۔ عام حالات میں دیکھئے تو یہ بات صاف نظر آتی ہے کہ چونکہ عصر کے وقت دن کی تمام سرگرمیاں اپنے آخری مرحلے میں داخل ہو رہی ہوتی ہیں اس وجہ سے دنیا طلبوں کے لئے یہ بڑی آپا دھاپی کا وقت ہوتا ہے، مسافر رات آنے سے پہلے منزل پر پہنچنا چاہتا ہے، دکاندار دکان بڑھانے سے پہلے کچھ کمائی کر لینے کی دھن میں ہو جاتا ہے، نوکر اپنی مقررہ ڈیوٹی کے سرانجام دینے کے چکر میں پڑ جاتا ہے، یہاں تک کہ

میدانوں میں کھلاڑی بھی اپنے آخری دائوں اور اپنی آخری بازی کے منصوبوں میں ایسے غرق ہوتے ہیں کہ کسی کو بھی کسی دوسری چیز کا کوئی ہوش نہیں رہ جاتا۔

اب اسی پر قیاس کیجئے کہ اگر خدانخواستہ حالات جنگ کے ہو جائیں تو پھر یہ آپا دھاپی کتنی بڑھ سکتی ہے، خاص طور پر دن کے اس حصے میں جس میں عصر کی نماز واقع ہے۔ اس وجہ سے قرآن نے عام نمازوں کی نگہداشت کا بھی حکم دیا اور ساتھ ہی عصر کی نماز کی نگہداشت کے لئے خاص طور پر تاکید فرمائی۔

رہا یہ سوال کہ اگر مقصود عصر کی نماز ہی تھی تو اس کو صاف صاف عصر کے لفظ ہی سے کیوں نہیں تعبیر کر دیا تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس لفظ کے استعمال سے اس نماز کا وہ نازک جائے وقوع ہمارے سامنے آجاتا ہے جس کے سبب سے یہ خاص نگہداشت کی محتاج ہے۔

یہ بات بھی یہاں یاد رکھنے کی ہے کہ یہی نماز ہے جس کے بارے میں حضرات انبیاء علیہم السلام میں سے دو نبیوں کو ابتلا پیش آیا۔ ایک حضرت سلیمان علیہ السلام کو فوجی پریڈ کے موقع پر، دوسرے ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو غزوہ احزاب کے موقع پر۔

"قنت" کے معنی خضوع اور تذلل کے ہیں۔ یہاں اس کا موقع ذکر اس بات کی دلیل ہے کہ نماز کی محافظت کے حکم میں نماز کا یہ ادب بھی داخل ہے۔

فَإِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا أَوْ رُكْبَانًا فَإِذَا أَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللَّهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ ﴿۲۳۹﴾

رجال، راجل کی اور رکبان، راکب کی جمع ہے۔ فرمایا کہ اگر دشمن نے حالت خطرے کی پیدا کر رکھی ہو، نماز اپنے تمام شرائط و آداب کے ساتھ ادا کرنی ممکن نہ ہو تو سوار پیادہ جس حال میں ہو اسی حال میں نماز ادا کر لو۔ خطرے کے حالات میں نماز کی محافظت یہی ہے۔ قرآن میں دوسری جگہ وہ شکل بھی بتا دی گئی ہے جو خطرے کے حالات میں نماز باجماعت کے قیام کے لئے اختیار کی جا سکتی ہے اگر اس کا امکان ہو۔

پھر فرمایا کہ جب امن کے حالات میسر ہوں تو اس طرح اللہ کو یاد کرو جس طرح اس نے تم کو سکھایا ہے۔ اللہ کو یاد کرو سے مراد ادائیگی نماز ہے۔ ذکر کا لفظ نماز کے لئے قرآن میں جگہ جگہ

استعمال ہوا ہے۔ نماز کی اصل حقیقت چونکہ ذکر ہی ہے اس وجہ سے کبھی کبھی اصل حقیقت سے اس کی شکل بھی تعبیر کر دی جاتی ہے تاکہ شکل اختیار کرتے وقت آدمی کی نظر اصل روح پر رہے، صرف شکل پر جم کر نہ رہ جائے۔

"کَمَا عَلَّمَکُمْ مَا لَمْ تَکُونُوا تَعْلَمُونَ" سے یہ بات بالکل واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم عین اللہ تعالیٰ کی تعلیم ہے۔ اس لئے کہ قرآن میں نماز کا حکم تو ہوا ہے لیکن اس کے ادا کرنے کا طریقہ کہیں نہیں بتایا گیا ہے، یہ چیز صرف پیغمبرؐ کی تعلیم سے اُمت کو معلوم ہوئی ہے، لیکن اس کے باوجود فرمایا کہ "جیساکہ اس نے تعلیم دی"۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر پیغمبرؐ کی تعلیم عین اللہ کی تعلیم نہیں ہے تو وہ کیا چیز ہے جس کو یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنی تعلیم سے تعبیر فرمایا ہے۔

ہم آیت یُعَلِّمُهُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَةَ کی وضاحت کرتے ہوئے بیان کر چکے ہیں کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ تصور کہ وہ صرف قرآن سُنا دینے کے لئے تشریف لائے تھے بنیادی طور پر غلط ہے۔ آپ قرآن سُنانے کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کام پر بھی مامور تھے کہ لوگوں کو قرآن پڑھائیں اور سکھائیں اور اس کے مضمرات و اشارات اور اس کی حکمتیں اور اس کے اسرار اچھی طرح واضح کر دیں اس کام پر آپ چونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مامور تھے اس وجہ سے ایک معلم کی حیثیت سے آپ نے اُمت کو جو کچھ بتایا سکھایا وہ سب آپ کے فریضہ نبوت ہی کے تحت ہے۔ تعجب ہے کہ ان واضح آیات کی موجودگی میں بھی بعض لوگ نماز کے اوقات اور اس کی رکعات وغیرہ سے متعلق بے سروپا بحثیں اُٹھاتے ہیں۔

"مَا لَمْ تَکُونُوا تَعْلَمُونَ" کے الفاظ بطور اظہار فضل و احسان کے ہیں۔ امی عربوں پر یہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا کرم ہوا تھا کہ ان پر اس نے دین و شریعت کے وہ اسرار کھولے جو نہ ان پر کھلے تھے، نہ اُن کے اگلوں پر کھلے تھے اور نہ کسی اور ہی پر کھلے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس فضل و احسان کا جواب ان کی طرف سے یہی زیبا ہے کہ اس کی قدر کریں، بنی اسرائیل کی طرح اس کی ناقدری نہ کریں۔

وَالَّذِیْنَ یُتَوَفَّوْنَ مِنْکُمْ وَیَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا ۚ وَّصِیَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَیْرَ اِخْرَاجٍ ۚ فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْکُمْ فِیْ مَا فَعَلْنَ فِیْۤ اَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوْفٍ ؕ وَاللّٰهُ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ ۝ ۲۴۰

وصیت کا لفظ فعل محذوف کا مفعول ہے۔ متاعًا وصیت کا مفعول ہے اور غیر اخراج ہمارے نزدیک لازوا جہم سے حال پڑا ہوا ہے۔ ترجمے میں ہم نے یہ ترکیب کلام واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگر نہ واضح ہو سکی ہو تو اس کو ہماری کوتاہی پر محمول کیجیے، تالیف کلام بہرحال ہمارے خیال میں یہی درست ہے۔

اُوپر آیت ۲۳۴ میں بیوہ عورتوں کی عدت بیان ہوئی ہے۔ انہی سے متعلق بعد میں یہ مزید ہدایت اوپر والی آیت ہی کی توضیح مزید کے طور پر نازل ہوئی کہ بیوائیں چھوڑ جانے والے شوہر اپنی بیواؤں کیلئے ایک سال کے نان نفقہ اور اپنے گھروں میں سکونت کی اجازت کی وصیت کر جائیں۔ اگر اس دوران میں بیوہ خود اپنی مرضی سے گھر چھوڑے اور اپنے نکاح ثانی یا اپنی سکونت کے سلسلہ میں دستور کے مطابق کوئی قدم اُٹھائے تو اس کا اسکو حق حاصل ہے۔ میت کے ورثہ کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ وصیت کی خلاف ورزی کریں۔

اس وصیت کی ہدایت اس وجہ سے ہوئی کہ ان آیات کے نزول کے زمانے تک میراث کا قانون ابھی نازل نہیں ہوا تھا چنانچہ اسی باب کے شروع میں (آیت ۱۸۰) والدین اور قرابتداروں کیلئے بھی وصیت کی ہدایت گزر چکی ہے اور ہم وہاں بیان کر چکے ہیں کہ یہ حکم عارضی طور پر اس وقت تک کیلئے دیا گیا تھا جب تک سورۂ نساء والا قانون وراثت نازل نہیں ہوا تھا۔ اسی قانون کے تحت بیوگان سے متعلق بھی یہ ہدایت ہوئی کہ انکے لئے ایک سال کے نان نفقہ اور سکونت کی وصیت کر دیجائے۔ ظاہر ہے کہ بعد میں جب وراثت کا قانون جاری ہوگیا اور مورث کے دوسرے وارثوں کی طرح اس کی بیوہ یا بیوگان کا حصہ بھی شریعت میں معین ہوگیا تو جس طرح والدین اور دوسرے وارثوں سے متعلق وصیت کی مذکورہ ہدایت منسوخ ہوگئی بیوگان کے لئے بھی یہ منسوخ ہوگئی اور اس کی جگہ وراثت کے مستقل قانون نے لے لی۔

اگر یہ آیت اوپر والی آیت یعنی آیت ۲۳۴ کے ساتھ ہوتی جس میں بیوہ کی عدت مذکور ہوئی ہے تو اس کا نظم سمجھنے میں کسی کو زحمت نہ ہوتی لیکن اس صورت میں یہ بات نہ واضح ہو سکتی کہ یہ آیت پہلے حکم کے بعد اسی حکم کی توضیح کے طور پر نازل ہوئی ہے۔ حالانکہ احکام کی تدریج اور ان کی حکمتیں سمجھنے کے لئے یہ چیز ضروری ہے۔ اسی حکمت کیلئے اس آیت کو اور اس کے ساتھ والی آیت کو، جیسا کہ ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں خاتمہ باب پر رکھ دیا اور یہ اشارہ کر دیا کہ یہ بعد میں نازل ہونے والی توضیحات ہیں۔

عزیز و حکیم کی صفات خدا کے حق قانون سازی اور اس کے قانون کے پُرحکمت ہونے کی طرف بھی اشارہ کر رہی ہیں اور اس کی خلاف ورزی کے نتائج کی طرف بھی۔ اسلام میں تمام دین و شریعت اور تمام امر و نہی

کی بنیاد خدا کی صفات ہی پر ہے۔ اس وجہ سے کہیں بھی ان کو محض برائے بیت نہیں خیال کرنا چاہیئے بلکہ ہر جگہ ان پر اسلام کے فلسفہ قانون اور فلسفۂ اخلاق کی بنیاد کی حیثیت سے غور کرنا چاہیئے۔

وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ۝ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝

اُوپر آیت ۲۳۶ میں مطلقہ عورتوں کو دے دلا کر رخصت کرنیکی جو ہدایت فرمائی تھی آخر میں یہ پھر اس کی یاددہانی کردی اور اسکو اہل تقویٰ پر ایک حق قرار دیا۔ جو حقوق صفات و کردار پر مبنی ہوتے ہیں بعض حالات میں وہ اس دنیوی زندگی میں تو قانون کی گرفت کے دائرے سے باہر ہوتے ہیں لیکن خدا کے ہاں ان صفات کیلئے وہ حقوق ہی معیار ٹھہریں گے۔ اگر ایک چیز مومنین یا محسنین یا متقین پر حق قرار دی گئی ہے تو یہ تو ہو سکتا ہے کہ اسلام کا قانون اس دنیا میں اس کی خلاف ورزی کرنے والوں پر کوئی گرفت نہ کرے لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ آخرت میں بھی ان کی خلاف ورزی پر کوئی اثر مترتب نہیں ہوگا۔ آخرت میں آدمی کا ایمان یا احسان یا تقویٰ انہی حقوق کی ادائیگی یا عدم ادائیگی کے اعتبار سے وزندار یا بے وزن ٹھہرے گا۔

آخری آیت میں كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ الآیۃ کا ٹکڑا بطور اظہار احسان ہے اور اس سے جیسا کہ ہم دوسری جگہوں پر واضح کر چکے ہیں، ان آیات کی نوعیت بھی واضح ہوتی ہے جن کی طرف كَذٰلِكَ کا اشارہ ہے۔ ہم بیان کر چکے ہیں کہ عموماً یہ ٹکڑا ان آیات کے بعد آتا ہے جن کی حیثیت توضیح مزید کی ہوتی ہے اور جو اپنے باب کے اصل احکام کے بعد لوگوں کے اندر سوال یا مزید جستجو اور تلاش پیدا ہونے کے بعد نازل ہوئی ہیں۔ ہم اپنی اس کتاب میں ان کو توضیحی آیات یا "مبینات" کی اصطلاح سے تعبیر کریں گے۔ نظم قرآن کے طالبوں کو بہت سے مقامات میں ان سے بڑی قیمتی رہنمائی ملتی ہے اس وجہ سے انکو نگاہ میں رکھنا چاہیئے۔

قرآن نے اجمال کے بعد تفصیل، ایجاز کے بعد توضیح اور توضیح کے بعد توضیح مزید کا یہ طریقہ جو اختیار کیا ہے اس میں تربیت کے بہت سے پہلو ہیں۔ از انجملہ اسکا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس سے دین میں غور و فکر اور اسکے فوائد و مصالح اور اسکے اسرار و حکم تک پہنچنے کیلئے ہماری عقل کی تربیت ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس تدریج کو نمایاں کر کے اس حقیقت کی طرف ہماری رہنمائی فرماتا ہے کہ ہم دین میں عقل کو کس طرح استعمال کر سکتے ہیں اور پیش آئے حالات و معاملات میں ان کلیات سے کس طرح جزئیات مستنبط کر سکتے ہیں۔ اسی حقیقت کی طرف لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ کے الفاظ اشارہ کر رہے ہیں۔

افاداتِ فراہیؒ

خالد مسعود صاحب

وحی کی حقیقت

آپ کو بارہا یہ تجربہ ہوا ہو گا کہ جب زیادہ عرصہ گزر جانے کی وجہ سے کسی شخص کا نام آپ کو بھول جاتا ہے تو اس کی یاد تازہ کرنے کے لئے آپ ذہن کو اپنے باطن کی طرف متوجہ کرتے ہیں اور ارادہ مضبوط کر لیتے ہیں۔ ذرا سی دیر میں آپ کی ذہنی قوتیں اس نام کو دوبارہ آپ کے حافظہ میں واپس لے آتی ہیں حالانکہ مدت سے بھولے ہوئے نام کا یاد آجانا آپ کیلئے موجب تعجب ہوتا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے آپ نے اپنی سابقہ معلومات کے خزانے کو کھنگال کر مطلوبہ چیز تلاش کرنے کے لئے ایک سراغ رساں مقرر کیا جس نے آپ کی ہدایت کے عین مطابق عمل کیا۔ ٹھیک یہی کیفیت شاعروں اور کاہنوں کی ہوتی ہے۔ وہ جب اپنے باطن کی طرف متوجہ ہو کر ارادہ کو ایک سمت میں مرتکز کر لیتے ہیں تو شعر یا سجع کہنے لگتے ہیں۔

ہمارا یہ بھی مشاہدہ ہے کہ ایک ایرانی اور ایک عرب ساتھ ساتھ بیٹھے ہوں اور ایرانی کو عربی کی اچھی مہارت نہ ہو تو وہ غیر ارادی طور پر کسی بات کا جواب فارسی میں دے دیتا ہے۔ مثلاً اگر وہ اثبات کے لئے نَعَمْ (ہاں) کہنا چاہتا ہے تو قبل اس کے کہ یہ لفظ اس کی زبان پر آئے اس کے منہ سے اس کا فارسی مترادف (بلے) نکل جاتا ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہوتی ہے کہ جواب دینے والے کا ذہن بات کے معنی و مفہوم پر مرتکز ہوتا ہے لیکن چونکہ اس کی زبان اس مفہوم کو ایک خاص لفظ سے ادا کرنے کی عادی ہوتی ہے اس لئے وہی لفظ سبقت کر کے اس کی زبان پر جاری ہو جاتا ہے حالانکہ آدمی اس کے کہنے کا کوئی ارادہ نہیں کرتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایک بات کو زبان پر جاری کرنے کے لئے

سادہ ارادہ ہی کافی ہوتا ہے۔ اس کی نمایاں ترین مثال ان خطیبوں یا شاعروں کے ہاں ملتی ہے جو ارتجالاً خطبہ یا شعر کہتے ہیں۔ مقرر جب تقریر کرتا ہے تو اس کی حیثیت ایک لبریز کنوئیں کی سی ہوتی ہے۔ وہ ایک بات کہتا ہے تو دوسری بات خود بخود استدلال وجواب یا تمثیل وغیرہ کے رنگ میں اس کی زبان پر جاری ہو جاتی ہے۔ ایک تجربہ کار مقرر تقریر کو پہلے سے تیار کرنے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کرتا وقت خود ہی اس کے کلام میں روانی پیدا کر دیتا ہے۔ اسی لئے حضرت مسیح علیہ السلام نے اپنے حواریوں کو تبلیغ کی مہم پر روانہ کرتے ہوئے یوں فرمایا تھا۔

"اور جب وہ تم کو عبادتخانوں میں اور حاکموں اور اختیار والوں کے پاس لے جائیں تو فکر نہ کرنا کہ ہم کس طرح یا کیا جواب دیں یا کیا کہیں کیونکہ روح القدس اسی گھڑی تمہیں سکھا دے گا کہ کیا کہنا چاہیئے"۔ (لوقا، ۱۲-۱۱، ۱۲)

اب ایک پیاسے شخص کی حالت پر غور کرو جو گرمی کے موسم میں ایک بیابان میں سفر کر رہا ہے۔ اچانک اسے کچھ فاصلے پر پانی کا ایک تالاب نظر آتا ہے۔ وہ اس کی طرف لپکتا ہے مگر اس کے قریب پہنچ کر دیکھتا ہے کہ وہ تو ایک سراب تھا جو اسے پانی کی شکل میں دکھائی دے رہا تھا۔ اس شخص کے ذہن میں پیاس کی وجہ سے تخیل وہ چیز مصور کر دیتا ہے جس کی اس کو فوری حاجت ہوتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہمارے باطن میں ایک مصور بھی موجود ہے اور ایک متکلم بھی۔ متکلم کا کلام ہم خواب میں سنتے اور سمجھتے ہیں اور اس کا جواب دیتے ہیں۔ کبھی کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ ہم شعر یا کوئی بلیغ خطبہ سن رہے ہوتے ہیں مگر اس کا قائل ہمارے فکر کے باطن کے علاوہ کوئی دوسرا نہیں ہوتا۔

اس تفصیل سے یہ نتیجہ نکلا کہ کلام ہمارے فکر کے اندر پیدا ہوتا ہے۔ اسے کہنے کے لئے آدمی کو محض سادہ ارادے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے ذہن میں حفظ اور تخیل وترتیب کی قوتیں خود بخود حرکت میں آتی ہیں اور ایک کلام بنا کر اسے ٹھیک ٹھیک پڑھنے لگتی ہیں، حالانکہ اس کا خیال کسی دوسری چیز میں لگ جاتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ غور و فکر کے لئے ایک خاص عمل کی ضرورت ہوتی ہے جو آدمی کے شعور سے تعلق نہیں رکھتا اور کلام کے ارادہ اور اس کے ظہور کے درمیان متعدد خفیف اعمال ہوتے ہیں۔ اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے آپ کھانا کھانا چاہیں تو شعوری طور پر آپ اس کا ارادہ کر لیتے ہیں۔ اس کے بعد عضلات، اعصاب، ہڈیاں زبان ہر چیز حرکت میں آجاتی ہے مگر آپ کو اس کا احساس نہیں ہوتا یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات کھانا کھاتے

ہوئے آدمی اپنی زبان بھی کاٹ لیتا ہے۔ اس مثال میں اعضا کی حرکت کا جو کردار ہے وہی کردار اُوپر کی مثال میں خیال اور حافظہ کی عقلی قوتوں کا ہوتا ہے۔

اعمال خواہ جسمانی ہوں یا عقلی، یہ جس طرح باطن سے نکال کر ظاہر کی طرف لائے جا سکتے ہیں[1] اسی طرح مشق اور عادت کے ذریعے آہستہ آہستہ ظاہر سے باطن (یعنی شعور سے لاشعور۔ مترجم) کی طرف منتقل بھی کئے جا سکتے ہیں۔ مثلاً ہر کام شروع شروع میں بڑی توجہ اور کوشش چاہتا ہے لیکن جوں جوں اس کی مشق زیادہ ہوتی جاتی ہے، اس کے کرنے کے لئے اتنی کوشش کی ضرورت نہیں رہتی یہاں تک کہ ایک وقت ایسا آتا ہے جب وہ کام لاشعور میں جگہ حاصل کر لیتا ہے جو کہ تمام ارادوں اور کاموں کا مرکز اور منبع ہے۔ اس وقت آدمی شعوری طور پر کام کی طرف توجہ کرنے سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ وہ اس کے سرانجام دینے کے لئے معمولی ارادہ کرتا ہے تو کام اس کے نتیجہ کے طور پر ظاہر ہونے لگتا ہے، حتیٰ کہ آدمی کو یہ احساس تک نہیں ہونے پاتا کہ اس کے باطنی قوٰی نے کام سرانجام دینے کے لئے کیا تگ و دو کی، یہ قوٰی لاشعور میں جمع شدہ فکر سے خود ہی ضروری باتیں حاصل کر لیتی ہیں۔

لاشعور میں ارادوں کا یہی منبع نبی کے معاملہ میں روح القدس اور وحی کا مہبط بنتا ہے۔ روح القدس نبی کے لاشعور میں کلمات اور شکلوں کے جمع شدہ ذخیرہ میں سے اپنے منشا کے مطابق کلام بناتا ہے لیکن اس عمل کا نبی کو احساس نہیں ہونے پاتا۔ وہ صرف اپنی قوم کی زبان میں ایک کلام سنتا ہے جو انہی اسلوبوں کے مطابق ہوتا ہے جن کا وہ پہلے سے عادی ہوتا ہے۔ البتہ چونکہ پاکیزہ اور مزکی روح اس کی طرف وحی کر رہی ہوتی ہے اس لئے وہ اس کلام میں نبی کی اپنی خواہش کو دخیل نہیں ہونے دیتی اور اس کے علم کے ذخیرہ میں سے بھی وہی کچھ لیتی ہے جو اس کے مقصد کے لئے بہترین ہوتا ہے۔ یہ عمل بالکل اسی طرح کا ہوتا ہے جس طرح ایک صالح بیج زرخیز زمین کے صرف اچھے اجزا کو حاصل کرتا ہے تو اس سے خوبصورت پھول کھلتے ہیں یا جس طرح شہد کی مکھی پھولوں اور پھلوں میں سے صرف اچھا رس چوستی ہے تو اس سے شفا بخش شہد حاصل ہوتا ہے۔

جہاں تک سچے خوابوں کا تعلق ہے، ان میں بھی آدمی کو وہی شکلیں دکھائی جاتی ہیں جن کا وہ پہلے سے عادی ہوتا ہے۔ اسی طرح خواب کی تمثیلیں، تشبیہیں اور اسالیب کلام بھی وہی ہوتے ہیں جو

[1] مثلاً ایک بھولی بسری بات کو سوچ بچار کے بعد ذہن میں تازہ کر لینا۔ (مترجم)

پہلے سے خواب دیکھنے والے شخص کی زبان پر جاری ہوتے ہیں۔ البتہ ان خوابوں میں آدمی کو جو کچھ نظر آتا ہے وہ خدا کی رضا اور اس کے اذن کے مطابق ہوتا ہے۔

اُوپر کی بحث سے دو نتیجے نکلتے ہیں - ایک یہ کہ پاکیزہ اور بلند کلام لازماً پاکیزہ اور بابرکت دل سے نکلتا ہے یہی وجہ ہے کہ مختلف انبیاء کی وحی کا اگر موازنہ کیا جائے تو اس میں ان کی انفرادی استعداد اور مدارج اخلاق کے لحاظ سے فرق نظر آئے گا۔

دوسرا یہ کہ کلام وحی کی تربیت نبی کے باطن میں ہوتی ہے جو روح القدس کے تصرف میں ہوتا ہے اور وحی کے کلمات اور الفاظ نبی کے ذہن میں محفوظ فکری ذخیرہ کے مطابق ہوتے ہیں، اس کے فکر سے بعید نہیں ہوتے۔ البتہ وہ نادر اور خصوصی حکمت کے حامل ہوتے ہیں جس تک ہر انسان کی نگاہ نہیں پہنچ سکتی۔ مثلاً توریت میں آتا ہے کہ شاہ بابل بنوخذنصر کے لڑکے بیلشاصر نے دیکھا کہ ایک غیبی ہاتھ نمودار ہوا اور اس کے محل کی دیوار پر ایک ایسا کلام لکھ دیا جس کو اس کے درباریوں میں سے کوئی نہ سمجھ سکا مگر دانیال نبیؑ نے اس کلام کا مفہوم بادشاہ کو بتا دیا[1]۔

نبی کے ساتھ کلام وحی کی اسی مناسبت ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ مختلف زمانوں میں انبیاء پر جو وحی نازل ہوئی، اس کے اسلوب بیان میں ہمیں نمایاں فرق نظر آتا ہے۔ حالانکہ اس فرق کی تاویل مخاطب کی رعایت سے نہیں کی جا سکتی اور اس میں بھی شبہ نہیں کہ یہ کلام روح القدس ہی کا القا کیا ہوا ہے۔ یہ فرق بالکل اسی طرح کا ہے جس طرح کا فرق ان مصنفین کے کلام میں ہوتا ہے جن کی تصنیف کے مابین زیادہ عرصہ گزر گیا ہو۔

اسی کے ساتھ یہ حقیقت بھی ملحوظ رہنی چاہیئے کہ کلام وحی میں لغت و اسلوب کے اس اختلاف کے باوجود ہمیں اصول میں کوئی اختلاف نظر نہیں آتا جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وحی خواہ موسیٰؑ یا عیسیٰؑ پر اُتری یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر، اس کا نازل کرنے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ جیسا کہ قرآن میں فرمایا

وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا (نساء ۸۲) اگر یہ خدا کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو وہ اس میں بڑا اختلاف پاتے۔

---

[1] بیلشاصر بن بنوخذنصر اور دانیال نبیؑ کا یہ واقعہ بائبل کے صحیفہ دانی ایل کے باب ۵ میں تفصیل سے بیان ہوا ہے۔ (خ۔م)

اس کلام کے من جانب اللہ ہونے ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ ایک وحی دوسری وحی کی تصدیق کرتی اور اسے مضبوط کرتی ہے۔ پس ایک سمجھدار شخص تمام مقدس کتابوں کو ایک دوسری کی روشنی میں زیادہ اچھی طرح سمجھ سکتا اور ان کی تاویل کر سکتا ہے۔ البتہ قرآن مجید کی تفسیر میں ضروری ہے کہ اسی کی آیات کو مضبوطی سے پکڑا جائے اور دوسری کتابوں پر اسے مقدم رکھا جائے۔ کیونکہ یہ کتاب آسمانی کتابوں کے مابین کی واحد قطعی کتاب ہے۔

جن لوگوں کا خیال یہ ہے کہ اسالیب کا اختلاف نبی کے اختلافِ احوال کے مطابق ہوتا ہے اور اگر کلامِ وحی خدا کی طرف سے نازل ہوتا تو لازماً ایک ہی اسلوب پر ہوتا، انہوں نے حقیقت کو سمجھنے میں غلطی کی ہے۔ ان کی توجہ اللہ تعالیٰ کی مصنوعات کے تنوع اور بوقلمونی پر نہیں گئی جس کی طرف قرآن نے اشارہ کیا ہے۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَاَلْوَانِكُمْ۔ (روم-۲۲)	اور اس کی نشانیوں میں سے آسمان و زمین کی خلقت ہے اور زبانوں اور رنگوں کا اختلاف۔

وحی مسموع فطرت کے موافق ہوتی ہے

اللہ تعالیٰ جب کسی انسان کو وحی مسموع سے نوازنا چاہتا ہے تو اپنی عطا کا دہانہ کھولنے سے قبل اس کے قلب کی اصلاح فرماتا ہے، جیسے زمین میں بیج ڈالنا ہو تو پہلے اس کی اصلاح کر لی جاتی ہے۔ جن روایات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا سینہ چاک کرنے اور اس کو دھونے کا ذکر آیا ہے، ان کی حقیقت یہی ہے۔ یہی مفہوم ان آیات سے بھی نکلتا ہے جن میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ انبیاء کو وحی عطا کئے جانے سے قبل ان کے رب نے انہیں بیّنہ (واضح دلیل) اور بصیرت سے نوازا۔ پس نبی کے اندر حق و باطل کی تمیز کی جو صلاحیت پیدا کی جاتی ہے، خدا کی وحی اسی کی شاہد بن کر نازل ہوتی ہے۔ سورہ ہود میں انبیاء کے واقعات بیان کرتے ہوئے اس حقیقت کی طرف کئی جگہ اشارات کئے گئے ہیں۔ مثلاً حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں فرمایا۔

اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ وَيَتْلُوْهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ وَمِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰٓى اِمَامًا وَّرَحْمَةً ط (ہود-۱۷)	بھلا جو شخص اپنے رب کی طرف سے ایک واضح دلیل پر رہا اور اسی کی جانب کا ایک شاہد اسے پڑھتا ہے اور اس سے پہلے موسیٰ کی کتاب بھی رہنما اور رحمت

ہے (اس کے یقین کو کیا چیز متزلزل کرے گی؟)

حضرت نوحؑ کے متعلق فرمایا۔

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَاٰتٰنِيْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِهٖ فَعُمِّيَتْ عَلَيْكُمْ اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَاَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ ۝

(ہود ۲۸)

اس نے کہا، اے میری قوم! بھلا دیکھو تو، اگر میں اپنے رب کی طرف سے ایک واضح دلیل پر تھا پھر اس نے اپنی رحمت سے مجھے نوازا جو تم سے اوجھل رکھی گئی تو کیا ہم اس کو تمہارے ساتھ چپکا دے رہے ہیں حالانکہ تم اسے ناپسند کرتے ہو؟

حضرت صالحؑ کے تذکرہ میں یوں فرمایا:۔

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَاٰتٰنِيْ مِنْهُ رَحْمَةً فَمَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ عَصَيْتُهٗ ،

(ہود ۶۳)

اس نے کہا، اے میری قوم! بھلا دیکھو تو سہی، اگر میں اپنے رب کی طرف سے ایک واضح دلیل پر تھا پھر اس نے مجھے اپنی رحمت سے نوازا تو اب اگر میں اس کی نافرمانی کروں تو مجھے اللہ سے کون بچائے گا؟

حضرت شعیبؑ نے یہی تقریر ان الفاظ میں کی۔

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَرَزَقَنِيْ مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا وَمَآ اُرِيْدُ اَنْ اُخَالِفَكُمْ اِلٰى مَآ اَنْهٰىكُمْ عَنْهُ ،

(ہود ۸۸)

اس نے کہا، اے میری قوم! بھلا دیکھو تو سہی۔ اگر میں اپنے رب کی طرف سے ایک واضح دلیل پر تھا پھر اس نے مجھے اپنی جانب سے رزق حسن عطا فرمایا تو کیا میں اس کی نافرمانی کروں) میں جس چیز سے تمہیں روک رہا ہوں اس سے مقصود تمہاری مخالفت کرنا نہیں

ان تمام آیات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ نبی پر وحی اس وقت نازل ہوتی ہے جب اس کو بیّنہ حاصل ہو چکتی ہے۔ یہاں وحی کی تعبیر کے لئے تین الفاظ استعمال کئے گئے ہیں — شاہد، رحمت، اور رزق حسن۔ وحی کے لئے ان تعبیرات کے شواہد قرآن اور سابقہ صحیفوں میں موجود ہیں۔

اس تفصیل سے دو باتیں واضح ہوئیں۔

ایک یہ کہ نبی جو کچھ جانتا ہے، وحی اسی کی تائید اور وضاحت کرتی ہوئی آتی ہے چنانچہ اس کے

نتیجہ میں نبی کا علم اور یقین پہلے سے زیادہ ہو جاتا ہے - مزید برآں عاقل لوگ نبی کی وحی کو جب اپنی فطرت کے الہام کے مطابق اور اسی کی تائید کرتے ہوئے پاتے ہیں تو وہ آیات الٰہی پر ایمان لے آتے ہیں -

فرمایا -

وَإِذَا مَا أُنزِلَتْ سُورَةٌ فَمِنْهُم مَّن يَقُولُ أَيُّكُمْ زَادَتْهُ هَٰذِهِ إِيمَانًا ۚ فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا فَزَادَتْهُمْ إِيمَانًا وَهُمْ يَسْتَبْشِرُونَ ۝ وَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا إِلَىٰ رِجْسِهِمْ

(توبہ ۱۲۴، ۱۲۵)

اور جب کوئی سورہ نازل کی جاتی ہے تو ان میں ایسے لوگ بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ اس سورہ نے تم میں سے کس کے ایمان میں اضافہ کیا - جہاں تک اہل ایمان کا تعلق ہے، سورہ نے ان کے ایمان میں اضافہ کیا اور وہ بشارت پاتے ہیں - رہے وہ لوگ جن کے دلوں میں بیماری ہے تو اس سورہ نے ان کی ناپاکی پر مزید ناپاکی کے رد سے چڑھا دیئے -

اسی سبب سے اللہ تعالیٰ نے اپنی آیات کو لوگوں کے لئے ذکر قرار دیا ہے[۵۱] -

---

۵۱ مثلاً آیات ذیل میں قرآن مجید کو ذکر کہا گیا ہے -

وَمَا يَأْتِيهِم مِّن ذِكْرٍ مِّنَ الرَّحْمَٰنِ مُحْدَثٍ إِلَّا كَانُوا عَنْهُ مُعْرِضِينَ (شعراء ۵)

اور ان کے پاس رحمان کی جانب سے کوئی نیا ذکر نہیں آتا مگر یہ کہ یہ اس سے منہ پھیرنے والے ہوتے ہیں -

إِنَّهُ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ (زخرف ۴۴)

بیشک یہ تیرے لئے اور تیری قوم کے لئے ذکر ہے -

اور یہ خصوصیت صرف قرآن ہی کے ساتھ وابستہ نہیں ہے بلکہ سابقہ آسمانی کتابوں کو بھی اسی لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے مثلاً حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا -

أَوَعَجِبْتُمْ أَن جَاءَكُمْ ذِكْرٌ مِّن رَّبِّكُمْ عَلَىٰ رَجُلٍ مِّنكُمْ (اعراف ۶۳)

کیا تم اس بات پر متعجب ہوتے ہو کہ تمہارے رب کی طرف سے تمہارے ہی ایک آدمی پر ذکر نازل ہوا -

توریت کو بھی قرآن میں ذکر کہا گیا ہے -

لَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِن بَعْدِ الذِّكْرِ (انبیاء ۱۰۵) ذکر کے بعد ہم نے زبور میں یہ لکھ دیا کہ .....

اسی مناسبت سے اہل کتاب کے لئے اہل الذکر کا لفظ بھی آیا ہے -

ذکر کے معنی یاد دہانی کے آتے ہیں اور مصنفؒ نے یہاں جس حقیقت کی طرف مجمل اشارہ فرمایا ہے وہ یہ ہے کہ

(باقی بر صفحہ ۵۰)

دوسری بات اس سے یہ واضح ہوئی کہ وحی اسی شخص کے لئے مفید ہوتی ہے جو پہلے سے اپنے علم کے مطابق دل کو پاک کر چکا ہو اور خدا کا خوف رکھتا ہو۔ جیسے فرمایا

وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى (محمد ۱۷) — جو لوگ ہدایت کی راہ پر چلتے ہیں وہ ان کو اور زیادہ ہدایت دیتا ہے۔

اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰٓئُهُمُ الطَّاغُوْتُ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ (بقرہ ۲۵۷) — اللہ اہل ایمان کا دوست ہے، ان کو تاریکی سے نکال کر روشنی میں لے آتا ہے۔ کافروں کے دوست طاغوت ہیں جو ان کو روشنی سے تاریکی میں لے جاتے ہیں۔

صحت وحی کے دلائل | وحی کو نفس کے وساوس سے ممیز کرنے والی کئی چیزیں ہیں جن میں سے چند ایک کا ہم یہاں حوالہ دیتے ہیں۔

۱۔ نفس انسانی کے دو افق ہیں۔ ایک اعلیٰ، دوسرا سفلی۔ افق اعلیٰ خیر اور بھلائی کا سرچشمہ ہے اور اس کا تعلق خدا کے ساتھ ہوتا ہے۔ وحی نفس کے اسی افق کی طرف سے آتی ہے۔ یہ سمجھنا غلط ہے کہ آدمی اپنے اعلیٰ اور سفلی افقوں سے آنے والے رجحانات میں تمیز نہیں کر سکتا۔ ہمارا مشاہدہ ہے کہ ایک عام انسان اور خصوصاً ایک عاقل انسان اپنے نفس کے صحت مند اور گھٹیا رجحانات میں فرق کرتا ہے۔

۲۔ وحی عموماً ایک ایسے راستہ سے آتی ہے جو ہمارے علم سے بالاتر ہوتا ہے جیسے خواب میں بعض اوقات ہمیں ایسی باتیں دکھائی جاتی ہیں جن کی حقیقت سے ہم کسی طرح واقف نہیں ہوتے۔ مثال کے

بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۷

انسان صالح فطرت کے ساتھ دنیا میں آتا ہے مگر بے علمی، رسم و رواج اور اشتغال بالدنیا کی کثافتیں اس فطرت کے خدوخال کو واضح نہیں رہنے دیتیں۔ آسمانی کتابیں جو اہم کام سرانجام دیتی ہیں وہ یہ ہوتا ہے کہ فطرت کے حقیقی آثار آدمی کے سامنے پھر سے نمایاں ہو جاتے ہیں۔ کلام وحی اس حقیقت کی یاددہانی کرا دیتا ہے، جس کا اصل وارث تو انسان ہی تھا مگر اپنی ناسمجھی کی وجہ سے اس سے غافل ہو چکا تھا۔ جن لوگوں کی فطرت پر کثافت کی تہیں زیادہ گہری نہیں ہوتیں، وہ نبی کی دعوت سے فوراً متنبہ ہو جاتے ہیں، کلام وحی میں اپنے دل کی صدائیں سنتے ہیں اور خدا کی آیات کو لپک کر قبول کرتے ہیں۔ (خ۔م)

طور پر ایک مرتبہ میں نے اپنے ایک نوجوان بھائی کو خواب میں دیکھا کہ وہ میرے سامنے کھڑا ہے اور میرے دیکھتے دیکھتے اس کے اوپر کے دانتوں میں سے سامنے کا دایاں دانت گر پڑا ہے۔ مجھے اس خواب سے بہت پریشانی ہوئی لیکن بھائی سے ملنے کی کوئی صورت نہ تھی کیونکہ وہ اس وقت مجھ سے بہت دُور تھا۔ اس واقعہ کو ابھی چند ہی روز گزرے تھے کہ مجھے بھائی کے اکلوتے اور محبوب بیٹے کی موت کی اطلاع ملی۔ یہ ایک ایسا سانحہ تھا جس کا وہم وگمان نہ خواب سے پہلے کبھی میرے دل میں تھا اور نہ خواب کے اندر اس کی طرف توجہ ہوئی تھی۔

۳۔ نبی کے لئے نزول وحی کی ابتدا بالکل خلاف توقع ہوتی ہے۔ اس میں اس کی تمنا کو بھی کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اس حقیقت کا مشاہدہ حضرت موسیٰؑ اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخ سے ہوتا ہے۔ دونوں نے نبوت کے بارگراں کو بڑی پریشانی کے عالم میں اٹھایا۔

۴۔ وحی واضح کشف کی شکل میں آتی ہے جس سے نبی کو ایسا یقین حاصل ہوتا ہے جو انسان کو صرف حسی مشاہدہ ہی سے نصیب ہوتا ہے۔

نکات ۲ تا ۴ پر قرآن کی یہ آیت دلیل ہے۔

وَمَا كُنْتَ تَدْرِي مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا (شوریٰ ۵۲)

اور تم نہیں جانتے تھے کہ کتاب یا ایمان کیا ہوتا ہے لیکن ہم نے اسے نور بنایا جس کے ذریعے ہم اپنے بندوں میں سے جس کو چاہیں ہدایت دیتے ہیں۔

نبی کو وحی کی ابتدا میں جو تردد ہوتا ہے وہ صرف ناقدانہ تردد ہوتا ہے اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ نبی وحی کے معاملہ میں بہت محتاط، سمجھدار اور خدا ترس ہوتا ہے۔

۵۔ وحی نبی کے پاس بڑے رعب و دبدبہ کے ساتھ حکم دیتی ہوئی آتی ہے۔ قرآن میں اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ ابتدائی وحی میں فرمایا

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ۔ (علق ۱)

پڑھ اپنے پروردگار کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا۔

يٰٓاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَاَنْذِرْ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ

اے چادر میں لپٹے ہوئے! اُٹھ متنبہ کر اور اپنے رب کی بڑائی بیان کر اور اپنا دامن بچائے رکھ

وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ ۝ (مدثر ۱-۷)
اور ناپاکی کو چھوڑ دے اور کوشش منقطع نہ کر تو تو زیادہ کریگا اور اپنے پروردگار کے ساتھ چارہ۔

يَا أَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ قُمِ اللَّيْلَ (مزمل ۱-۲)
اے کمبل اوڑھنے والے! رات میں قیام کر۔

وحی کے اس انداز کا مشاہدہ ہم اپنے نفسوں میں اس وقت کرتے ہیں جب ہمارا ضمیر تقویٰ اور حدود الٰہی کی محافظت کے تقاضوں کو ہمارے سامنے ایک حکم کی شکل میں رکھتا ہے۔

تعلیم وحی کی ابتداء جب اللہ تعالیٰ نبی کے قلب کو وحی کے الہام کے لئے منتخب فرمالیتا ہے تو سب سے پہلے توحید، نماز، انابت الی اللہ اور خدا کی عدالت کی تعلیم القا کرتا ہے۔ چونکہ یہ تعلیم نبی کی فطرت کی آواز کے مطابق ہوتی ہے اس لئے اس سے نبی کا دل مطمئن ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر تجلی طور میں حضرت موسیٰ کو یوں خطاب کیا گیا۔

وَأَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوحَىٰ ۝ إِنَّنِي أَنَا اللَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدْنِي وَأَقِمِ الصَّلَاةَ لِذِكْرِي ۝ إِنَّ السَّاعَةَ آتِيَةٌ أَكَادُ أُخْفِيهَا لِتُجْزَىٰ كُلُّ نَفْسٍ بِمَا تَسْعَىٰ ۝ فَلَا يَصُدَّنَّكَ عَنْهَا مَنْ لَا يُؤْمِنُ بِهَا وَاتَّبَعَ هَوَاهُ فَتَرْدَىٰ ۝ (طہ ۱۳-۱۶)
میں نے تجھے منتخب کر لیا ہے پس جو وحی کی جاتی ہے اس کو سنو۔ میں اللہ ہوں، میرے سوا کوئی معبود نہیں پس میری عبادت کرو اور میری یاد کے لئے نماز قائم کرو۔ قیامت کو اگرچہ میں مخفی رکھوں گا مگر وہ آنیوالی ہے تاکہ ہر جان کو اس کی کوشش کا بدلہ دیا جائے پس اس تعلیم سے تمہیں وہ شخص پھیر نہ دے جو اس پر ایمان نہیں رکھتا اور اپنی خواہش کے پیچھے چلتا ہے ورنہ تم ہلاک ہو جاؤ گے۔

گویا توحید و معاد کی تعلیم دینے کے بعد کفار کی دشمنی کے مقابلہ کے لئے نماز پر ثابت قدم رہنے کا حکم دیا۔

اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں یوں فرمایا۔

إِنَّ إِبْرَاهِيمَ كَانَ أُمَّةً قَانِتًا لِلَّهِ حَنِيفًا وَلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝ شَاكِرًا لِأَنْعُمِهِ اجْتَبَاهُ وَهَدَاهُ إِلَىٰ صِرَاطٍ
بیشک ابراہیم ایک الگ امت تھا خدا کا فرمانبردار اور یکسو۔ اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھا۔ وہ خدا کی نعمتوں کا شکر گزار تھا۔ خدا نے اسے برگزیدہ کیا

مُّسْتَقِيْمٍ ۝ (نحل ۱۲۰) اور اس کو سیدھے راستے کی ہدایت دی۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو آغاز وحی میں نماز کا حکم دیا گیا۔ فرمایا

اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝ اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ۝ (علق ۱-۵)

پڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا۔ اس نے انسان کو ایک لوتھڑے سے پیدا کیا۔ پڑھ اور تیرا رب فیاض ہے جس نے قلم کو ذریعہ تعلیم بنایا۔ اس نے انسان کو وہ تعلیم دی جس سے وہ بے خبر تھا۔

گویا نماز کا یہ حکم خدا کے دو احسانوں کے پہلو سے دیا گیا۔ ایک یہ کہ اسی نے انسان کی تخلیق کی۔ دوسرے یہ کہ اس نے انسان کو دنیا میں بھٹکنے کے لئے نہیں چھوڑ دیا بلکہ اس کے لئے ہدایت کی مشعلیں روشن کیں ـــــ اس کے بعد آیت

اِنَّ اِلٰى رَبِّكَ الرُّجْعٰى ۔ (علق ۸) بیشک تیرے رب ہی کی طرف واپسی ہوگی۔

کے ذریعے معاد کی تعلیم دی گئی۔ اس کے بعد باقی سورہ میں سرکش معاندین کی خواہش کے علی الرغم نماز پر ثابت قدم رہنے کی تلقین کی گئی۔ سورہ مزمل کی تمام قیام لیل کے حکم پر مشتمل ہے۔ سورۂ مدثر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو انذار کا حکم دیا گیا۔

توحید اور نماز کے بعد نبی کو احسان کا حکم دیا جاتا ہے۔ چونکہ تمام تر بھلائی دو ہی چیزوں پر مشتمل ہے۔ ایک خدا کی یاد اور دوسری مخلوقات سے ہمدردی، اس لئے اس مرحلہ میں وحی پوری طرح فطرت کے موافق ہو جاتی ہے اور نبی کا دل مطمئن ہو جاتا ہے۔ وہ نماز پڑھتا ہے، خدا کی طرف راغب ہوتا ہے اور مخلوق کے ساتھ احسان کا برتاؤ کرتا ہے۔ وہ دوسرے لوگوں کو بھی بنیادی بھلائیوں۔ نماز و زکوٰۃ کی طرف بلاتا ہے اور اس تعلیم کو اختیار کرنے کی بشارتوں اور اس کو ٹھکرانے کے بُرے نتائج سے ان کو آگاہ کرتا ہے۔

اقتباسات وتراجم

جناب خالد مسعود صاحب

دورِ حاضر میں تنظیم اجتہاد کی ایک اسکیم

ذیل کا مضمون استاذ احمد مصطفیٰ زرقا کے ایک مقالہ طابع الاجتہاد فی الماضی ودورہ فی المستقبل کا ملخص ہے۔ یہ مقالہ البعث الاسلامی میں شائع ہوا ہے۔

شریعت اسلامی کی خدمت اور فقہ کی تدوین میں اجتہاد نے ایک اہم کردار ادا کیا ہے حقیقت یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد اسلام کے دائرہ قانون میں جو عظیم خلا پیدا ہو گیا تھا، اجتہاد نے اس کو پُر کیا۔

حضور جب دنیا سے تشریف لے گئے تو قرآن کی چند سو آیاتِ احکام اور تقریباً اس قدر احادیث مسلمانوں کے لئے مشعل راہ تھیں۔ نصوص کی اس قلیل مقدار ہی نے اسلامی قانون کے اصول وقواعد اور نظریات واحکام کے انضباط اور فقہ کی تدوین کے لئے بنیاد کا کام دیا۔ ان میں سے ایک ایک آیت اور حدیث کے اندر ایسے ایسے شہرستان معانی آباد تھے کہ فقہا نے بلا تکلف ان سے بیشمار اصول وضع کئے۔ مثال کے طور پر قرآن مجید میں ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَوْفُوا بِالْعُقُودِ — اے ایمان والو، اپنے عہد پورے کرو۔

(مائدہ ۱)

اور ایک مشہور حدیث ہے کہ

لاضرر ولاضرار فی الاسلام — اسلام میں کوئی ایسا معاملہ جائز نہیں ہے جس سے کوئی ایک فریق نقصان اُٹھائے یا دوسرے فریق کو نقصان پہنچائے۔

اس طرح کی نصوص مبادیاتِ شریعت کا کام دیتی ہیں اور آئندہ بھی ہمیشہ کے لئے وضع قانون میں بڑی آسانیاں پیدا کرتی رہیں گی۔

تیسری صدی ہجری تک (یعنی صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کے ادوار میں) جزیرہ عرب اور ممالک مفتوحہ میں اہل اجتہاد کی اتنی کثرت تھی کہ ان کا شمار ممکن نہ تھا۔ ان میں سے ہر مجتہد کے اپنے وضع کردہ اصولِ استنباط تھے جن کے ذریعے وہ نصوص کی روشنی میں نئے مسائل کے بارے میں رائے قائم کرتا تھا۔ ایک مجتہد کے اصولِ استنباط سے دوسرے مجتہد کا اتفاق ضروری نہ تھا۔ چونکہ تمام مباحث میں ہر مجتہد کی اپنی الگ رائے ہوتی تھی اسلئے اس دور میں فقہی مذاہب بھی فقہا کی تعداد کے برابر ہی تھے۔ لیکن یہ تمام اختلاف بعد کی نسلوں کو منتقل نہیں ہوا۔ بے شمار مذاہب کا وجود تو مجتہدین کی وفات کے ساتھ ہی دُنیا سے مٹ گیا۔ بعض کا تذکرہ اختلافاتِ فقہا کی کتابوں میں اب تک ملتا ہے۔ قبول عام گنتی کے صرف چند مذاہب کو حاصل ہوا۔ اس کی شکل یہ ہوئی کہ ائمہ مجتہدین کے شاگردوں نے ان کی فقہ کو محفوظ و مدون کر دیا تو ممالک اسلامیہ میں اس کو اتنی وسعت حاصل ہوئی کہ ان فقہوں کا وجود ہمیشہ کے لئے باقی رہ گیا۔ یہ مذاہب مشہور عالم چار فقہی مذاہب ہیں۔ ان کے قرار واستحکام اور کتب فقہ کی کثرت تالیف کا نتیجہ یہ نکلا کہ اجتہاد کی روح مدھم پڑ گئی اور مقلدین پیدا ہونے لگے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ لوگوں میں علوم شریعت اور لغت میں تبحر پیدا کرنے کا شوق کم ہو گیا۔ عباسی خاندان کے دورِ عروج کے بعد سے عالم اسلامی میں انہی چاروں مذاہب میں سے کسی نہ کسی کو سیادت حاصل رہی ہے۔

تیسری صدی کے بعد مذاہب اربعہ کے متبعین میں سے بعض سرکردہ علماء نے تفریع و تخریج کا کام کیا اور متعدد کتابیں تصنیف کیں۔ انہوں نے دیکھا کہ فقہ اسلامی میں کفایت حاصل ہو چکی ہے، ایسے بنیادی مسائل باقی نہیں رہ گئے ہیں جن کے بارے میں فقہا کی رائے نہ آچکی ہو، مزید برآں جمہور اُمت کے لئے صحیح و غلط میں تمیز کرنا مشکل کام ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی فسادی شخص اپنی نااہلیت کے باوجود شریعت اسلامی میں پنچ لگانے کی کوشش کرے اور لوگوں کے دین کے ساتھ کھیلنا شروع کر دے۔ اس وجہ سے انہوں نے چوتھی صدی ہجری کے بعد اجتہاد کا دروازہ بند کرنے کا فتویٰ دے دیا۔

لیکن اس فتویٰ کے نتیجہ میں اجتہاد کی کوششیں بالکل سرد نہیں پڑ گئی تھیں بلکہ بعد کے ادوار

میں بھی نئے مسائل کے حل کے لئے علماء نے اپنے اپنے فقہی مذاہب کی بنیادوں پر محدود اجتہاد کا سلسلہ جاری رکھا اور استحسان اور مصالح مرسلہ کے قاعدوں پر اپنی آرا پیش کیں۔ پانچویں صدی ہجری میں سود کی مشکلات سے بچنے کے لئے مذہب حنفی میں بیع وفا کے احکام اسی بنیاد پر منضبط کئے گئے۔ اسی طرح فقہاء متاخرین نے یہ فتویٰ دیا کہ قرضخواہوں کی رضامندی حاصل کئے بغیر ایک ایسے مقروض کے مالی تصرفات نافذ نہیں ہو سکتے جس کے قرض میں اس کی پوری جائیداد وضع کی جا سکتی ہو۔ یہ فتوے اس اندیشے کے پیش نظر دیا گیا کہ مقروض شخص وقف، ہبہ یا اس طرح کے دوسرے طریقوں سے اپنی جائیداد قرضخواہوں سے بچانے کی کوشش کرے گا۔ اس دور میں اس طرح کے بیشمار مسائل استحسان کے بارے میں علمائے فتوے دیئے۔

آہستہ آہستہ یہ مفید و محدود اجتہاد بھی کمزور پڑ گیا۔ آخر کار فقہ اسلامی نئے مسائل کے متعلق رائے دینے کے معاملہ میں بالکل بانجھ ثابت ہونے لگی۔ اس کی حیثیت یہ رہ گئی کہ علوم دین کے طلبہ اس کو رٹ لیا کریں۔ حتیٰ کہ آج جن لوگوں کو علماء و فقہا کا نام دیا جاتا ہے وہ بھی فقہ کی تعلیم میں احکام مذہب کی دلالتوں پر بحث سے ناواقف ہوتے ہیں حالانکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ اجتہاد شریعت کی رُوح اور قانون اسلامی کی زندگی کی علامت ہے۔

فقہ کے اس جمود کا نتیجہ یہ نکلا کہ عہد عثمانی کے بعد سے حکمران طبقہ شریعت اسلامی کے اندر ایسی صلاحیت ہی کا انکار کرنے لگا کہ اسی کے بل بوتے پر عصری تقاضوں کے مطابق قوانین وضع کئے جا سکتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے غیر اسلامی قوانین کو اسلامی ممالک میں نافذ کر دیا۔ اس طرح فقہ اسلامی حکومت کے دائرے سے سمٹ کر علمی و عملی دونوں اعتبار سے معاشرہ کے بعض طبقات میں محدود ہو کر رہ گئی۔

معلوم ہوتا ہے کہ فقہ کے اس انجام کے آثار ابن قیمؒ کے زمانے میں بھی ظاہر ہونے لگے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی کتاب "الطرق الحکمیۃ" میں اس موضوع پر زوردار بحث کی ہے۔ انہوں نے "اعلام الموقعین" میں بھی فقہاً مذاہب کے جمود کو نشانہ بنایا ہے اور حکمران طبقہ کے غیر اسلامی قوانین کی طرف میلان کا سبب اس بات کو قرار دیا ہے کہ فقہاء نے شریعت کے دائرے کو محدود کر کے فقہ کو زندگی کے مسائل کے لحاظ سے ناکافی بنا دیا ہے۔ حالانکہ تنگی شریعت کے دائرہ

کار میں نہیں بلکہ پیروانِ مذاہب کی عقلوں میں ہے۔ اس تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ اجتہاد کے دروازے کا بند کرنا ایک عظیم حادثہ تھا جس سے شریعت اسلامی اور اس کی جلیل القدر فقہ دوچار ہوئی۔

امر واقعی یہ ہے کہ جب تک اسلام انسانی مسائل کو حل کرنے میں اپنا کردار ادا کرنا چاہتا ہے اجتہاد کے دروازے کو بند کرنے کا اختیار کسی کو حاصل نہیں۔ اسی لئے مذاہب اربعہ کے علمائے متاخرین نے اپنی کتابوں میں اس بات کی وضاحت کی ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے تبحر علمی کی بنا پر اجتہاد کے رتبہ کو پہنچ جائے اور اس کے اندر اس کی اہلیت اور شرائط پائی جائیں تو اس کے لئے مذاہب کی تقلید جائز نہیں۔ دوسری طرف یہی علماء کسی کا یہ مرتبہ تسلیم نہیں کرتے کہ وہ اجتہاد کی اہلیت اپنے اندر پیدا کر سکا ہو۔ گویا ان کے نزدیک اجتہاد کا دروازہ کھولنے کی ممانعت تو نہیں مگر اس کی وہ چابی گم ہو چکی ہے جس سے اس کا قفل کھلتا ہے۔ ساتویں صدی ہجری کے مشہور شافعی فقیہہ علامہ عزالدین بن عبدالسلام لکھتے ہیں۔

"اجتہاد کا دروازہ بند کرنے میں اختلاف کیا گیا ہے ..... یہ تمام اقوال فاسد ہیں کیونکہ جب کبھی کوئی نیا مسئلہ درپیش ہو جس کے بارے میں نص موجود نہ ہو یا جس میں سلف نے اختلاف کیا ہو، اس وقت کتاب وسنت کی روشنی میں اجتہاد کئے بغیر چارہ نہیں جو شخص اس کے علاوہ کوئی بات کہتا ہے وہ محض ہذیان ہے۔"

اجتہاد کی بندش کے بارے میں منصفانہ فیصلہ کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ گہری نظر سے یہ متعین کیا جائے کہ ماضی میں اس کا مزاج کیا تھا۔

صدرِ اوّل میں اجتہاد کا مزاج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے فوراً بعد حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ نے اجتہاد کا جو طریقہ اختیار کیا وہ فرد واحد کے بجائے شوریٰ کے اجتہاد کا طریقہ تھا۔ خلفائے کرام اہم معاملات میں۔ خواہ وہ حقوق سے متعلق ہوں یا سیاست سے متعلق۔ صحابہ کو جمع کر کے باہمی اتفاق رائے سے مسائل کو حل کرتے۔ ایسا کرنے کی وجوہ دو تھیں۔ ایک تو قرآن کریم نے تمام معاملات میں شوریٰ سے فیصلہ کرنے کا حکم دیا تھا، دوسری نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اسی کی تلقین فرمائی تھی۔ ایک مرتبہ حضرت علیؓ نے حضورؐ سے دریافت کیا کہ جب ہمیں

کو کہیں کا عامل مقرر کیا جاتا ہے تو وہ ان معاملات میں کیا طرزِ عمل اختیار کریں جن کے بارے میں کتاب اللہ اور سنتِ رسول میں کوئی واضح ہدایت نہ ملتی ہو۔ آپ نے فرمایا

اَجْمَعُوْا لَهُ الْعٰلِمِيْنَ وَلَا تَقْضُوْا فِيْهِ بِرَأْيٍ وَاحِدٍ — اس کیلئے جاننے والوں کو جمع کر لو اور انفرادی رائے سے اس کا فیصلہ نہ کرو۔

اس کے بعد کے ادوار میں اجتہاد کی شکل بہت کچھ تبدیل ہوگئی۔ صحابہ چونکہ مملکت کے دور دراز حصّوں میں پھیل گئے تھے اس لئے باہم مشورہ کے لئے ان کا جمع ہونا ممکن نہ رہا۔ جوں جوں کسی کو کوئی نیا مسئلہ درپیش ہوتا وہ کتاب اللہ اور سنت رسولؐ کی روشنی میں خود ہی انفرادی رائے قائم کر لیتا۔ گویا اس دور میں اجتہاد تمامتر انفرادی نوعیت کا تھا۔

اسلام کے صدر اول میں لوگوں کا زمانہ دورِ نبوّت سے قریب تو تھا ہی، اسلام کا اثر بھی ان کے دلوں پر بہت گہرا تھا۔ تیسری صدی تک یہ کیفیت رہی کہ لوگ قرآن فہمی، حصول حدیث اور تحصیل فقہ ولغت کے مقاصد کے لئے اپنی زندگیاں وقف کر دیتے تھے۔ اس زمانہ میں ایک خدا ترس قابل اعتماد عالم کی دوسرے شخص سے بڑی آسانی سے تمیز ہو جاتی تھی۔ اس کے بعد جب عہد نبوی سے لوگ بہت دُور ہوگئے، حقیقی اور خود ساختہ عالم میں لوگ کم تمیز کرنے لگے، ورع اور پرہیزگاری خال خال رہ گئی تو مذاہب اربعہ کے پیروکاروں کو چوتھی صدی میں یہ اندیشہ ہونے لگا کہ کوئی مکار شخص اجتہاد کے نام پر لادینی اور بدعت کا کاروبار نہ چلانا شروع کر دے اور اس طرح شریعت کی بنیادوں کو ڈھانے کے درپے نہ ہو جائے۔ ان لوگوں کو چونکہ مذاہب اربعہ کی تفریعات کی کفایت کا احساس تھا اس لئے انہوں نے اجتہاد کے دروازے کو بند کرنے کا فتویٰ دے دیا۔

صدر اول میں اجتہاد کی نوعیت کے مذکورہ تجزیہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس دور کے مجتہدین کے انفرادی اجتہاد سے اُمت نے بے حد فائدہ اٹھایا۔ یہ لوگ فقہ اسلامی کی محافظت اور آبیاری کرتے رہے۔ انہوں نے نصوص کی روشنی میں باہمی تعاون سے قواعد، نظریات، فروعی احکام اور قوانین ہر چیز کو منضبط کر دیا اور فقہ کو ہر پہلو سے اس قدر جامع بنا دیا کہ دنیا ختم ہو جائے مگر ان قوانین کی افادیت ختم نہیں ہو سکتی۔ اگر تیسری صدی میں اجتہاد کی انفرادی کوششیں نہ ہوتیں تو تاریخ انسانی کا وہ عظیم کارنامہ جو فقہ اسلامی کی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہے وقوع پذیر نہ

ہو سکتا۔

صدر اول کے بعد اجتہاد کا دروازہ بند ہوا تو اس میں بھی بہت حکمت اور بھلائی تھی۔ اس زمانے کے فقہاء کا یہ اندیشہ بہت اہم تھا کہ اگر انفرادی اجتہاد کی اجازت باقی رہی تو فقہ عجیب قسم کے انتشار و پراگندگی سے دوچار ہوگی۔ البتہ اس موقع پر یہ غلطی ضرور ہوئی کہ لوگوں نے اجتہاد کو مطلقاً روک دیا جس سے قانون اسلامی پر جمود طاری ہو گیا اور زمانے کی ضرورتیں بھی اس سے پوری نہ ہو سکیں۔ اس موقع پر وقت کا تقاضا اجتہاد کی حرمت کا فتویٰ دینے کا نہیں بلکہ اس کی تنظیم کی کوشش کرنے کا تھا۔ مستقبل میں بھی اگر ہم اسلامی قانون کو مشعل راہ بنانا چاہیں تو ہمیں اجتہاد کو منظم کرنے کی فکر ہی ہونی چاہیئے۔

تنظیم اجتہاد کی ایک اسکیم ماضی میں اجتہاد سے متعلق اپنی خطا سے واقف ہونے کے بعد یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ مستقبل میں اجتہاد کا طریق کار کیا ہونا چاہیئے۔

جہاں تک انفرادی اجتہاد کا تعلق ہے، یہ اگرچہ ماضی میں ایک ضرورت تھا مگر اب اس سے اُمت میں بڑے فتنے پھیل سکتے ہیں۔

چوتھی صدی کے اندیشے جن کی بدولت اجتہاد کا دروازہ مسدود کیا گیا تھا، ہمارے زمانے میں حقیقت بن چکے ہیں۔ اہل دین کے طبقے میں اب بھی ایسے لوگ نکل تو آئیں گے جن کو علم پر عبور حاصل ہے اور جو پرہیزگار اور حق گو بھی ہیں لیکن اکثریت ان لوگوں کی ملے گی جنہوں نے دین کو دنیاداری کا ذریعہ بنا رکھا ہے۔ دینی مدارس کے کتنے ہی فارغ التحصیل ایسے ہیں جنہوں نے اپنی صلاحیتیں اسلام کے دشمنوں کے ہاتھوں میں فروخت کر رکھی ہیں۔ وہ آزادیِ فکر اور اجتہاد کے پردے میں اسلام کی بنیادوں کو ہلانے کے درپے ہیں۔ اس جدوجہد کے بدلے میں ان کو دنیا کے فوائد تو بیشک حاصل ہوتے ہیں مگر اس پر وہ خدا کی لعنت کے جو مستحق ہو رہے ہیں اس کا ان کو کچھ خیال نہیں۔

ان حالات میں اگر ہم یہ چاہتے ہوں کہ شریعت اور فقہ اسلامی میں پھر سے زندگی پیدا ہو تو اس کا طریقہ اجتہاد کا انضباط ہی ہوگا۔ یہ تو واضح ہو چکا کہ شرعی اعتبار سے اجتہاد ہم پر ہمیشہ کے لئے واجب ہے اور زمانے کے پیدا شدہ مسائل کو شریعت کی روشنی میں حل کرنے کا یہ واحد ذریعہ ہے۔ ہمارے نزدیک اس دور میں اجتہاد کے لئے ایک جدید طریقہ کار اپنانا مفید رہے گا اور وہ انفرادی

اجتہاد کے بجائے جماعتی اجتہاد کا طریقہ ہے۔ اگر اس کو اپنا لیا جائے تو گویا ہم ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کے زمانے کی خصوصیت لوٹا دیں گے۔

ہمارے نزدیک اس کی موزوں و قابلِ عمل اسکیم یہ ہو سکتی ہے کہ علمی و ادبی اکیڈمیوں کے طرز پر ایک فقہ اسلامی اکیڈمی قائم کی جائے۔ ہر بڑے شہر کے وہ قابل فقہاء اس اکیڈمی کے رکن ہوں جو علمِ دین حاصل کئے ہوئے ہیں، سیرت و تقویٰ کے اعتبار سے قابلِ اعتماد ہیں اور زمانے کے مسائل سے واقف ہیں۔ اس اکیڈمی میں وہ مسلمان اہلِ علم بھی شامل کئے جائیں جو دیندار ہیں اور عصری علوم — یعنی اقتصادیات، قانون، اجتماعیات و سیاسیات، ڈاکٹری وغیرہ میں درجۂ اختصاص رکھتے ہیں۔ یہ لوگ فنی معاملات میں فقہا کو ضروری معلومات بہم پہنچائیں۔

فقہی اکیڈمی کے تمام ارکان کو اپنا پورا وقت اسی کام پر صرف کرنا چاہیئے، ان کے مطالعہ کے لئے ضروری لائبریریاں ہوں، انہیں فکرِ معاش سے آزاد رکھنے کے لئے اچھی تنخواہیں دی جائیں، وہ سوسائٹیوں اور سمپوزیم کی مجالس میں زمانے کے مسائل کے بارے میں اسلامی تعلیمات سے لوگوں کو آگاہ کریں، اپنے مضامین کی اشاعت کے لئے رسالے جاری کریں اور فقہ اسلامی کا انسائیکلوپیڈیا مرتب کریں تاکہ اس کے ذریعے لوگ اپنے معاملات میں آسانی سے قانونی رہنمائی حاصل کر سکیں۔ اسی طرح یہ اکیڈمی ہر ضروری لٹریچر شائع کرے جو فقہ اسلامی کے نقطۂ نظر سے ضروری ہو۔

اس اسکیم کے مصارف کے لئے کافی رقم درکار ہوگی۔ اس کا حصول دو طریقوں سے ممکن ہے۔ یا تو مسلمانوں کے بعض طبقوں پر اس مقصد کے لئے خاص ٹیکس لگایا جائے (اگرچہ مسلمانوں کے طبقہ امراء میں اسلام کے ساتھ کچھ زیادہ وابستگی نہیں پائی جاتی) یا اسلامی حکومتیں اپنے اپنے بجٹ میں اس کے لئے خاص رقم مقرر کریں۔ اس طرح کی تجویز مؤتمر عالم اسلامی کے دو اجلاسوں میں ۱۹۳۹ء میں پیش ہوئی تھی مگر اس کا تذکرہ کاغذ ہی پر باقی رہ گیا، اس پر کسی نے عمل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ بڑے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اسلامی حکومتیں ہر کام میں مال صرف کرتی ہیں مگر اسلام کے لئے کوئی رقم صرف کرنا ان پر شاق گزرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بہرحال سچ ہے کہ

فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ پس ایسا کیوں نہ ہوا کہ ان کے ہر گروہ میں سے

لِيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَلِيُنذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ ۔ (توبہ ۱۲۲)

ایک ایک جماعت اس مقصد سے نکلتی کہ وہ دین کی سمجھ پیدا کریں اور جب لوٹیں تو اپنی قوم کو ہوشیار کریں تاکہ وہ بچیں ۔

موجودہ دور میں میں اسی اسکیم کو مفید سمجھتا ہوں اور لوگوں کو اسی کی دعوت دیتا ہوں ۔

قُلْ هَٰذِهِ سَبِيلِي أَدْعُو إِلَى اللَّهِ عَلَىٰ بَصِيرَةٍ أَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِي ۔

کہہ دو، یہی میرا راستہ ہے، میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں ۔ میں اور میرے متبعین سب بصیرت پر ہیں ۔

کیا ☆

☆ اسلام آج کی دنیا میں بحیثیت نظام رائج ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے ؟

☆ کیا اسلامی قانون کی تدوین ممکن ہے ؟ اور مسلمان جو متعدد اور باہم متصادم فرقوں اور گروہوں میں منقسم ہو چکے ہیں کیا اسلامی قوانین کے ایک ہی مجموعے پر متحد و متفق ہو سکتے ہیں ؟

ان سوالات کے جواب آپ کو اسلامی قانون کے ماہر اور علومِ قرآنی کے غواص، عالم دین جناب مولانا امین احسن اصلاحی کی تازہ ترین تالیف

"اسلامی قانون کی تدوین"

میں ملیں گے ۔ قیمت اعلیٰ ایڈیشن ۳۰/- روپے سستا ایڈیشن ۲۰/- روپے علاوہ محصول ڈاک

ملنے کا پتہ:- **مکتبۂ میثاق** رحمانپورہ، اچھرہ لاہور ۱۲

بحث و نظر

جناب ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب
ڈائرکٹر سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک ریسرچ کراچی

پاکستان میں خاندانی منصوبہ بندی اور مذہب

ذیل کا مضمون مصنف کے ایک مقالہ RELIGION AND PLANNED PARENTHOOD IN PAKISTAN. کا ترجمہ ہے۔ اس کی اشاعت کی ضرورت اس لئے محسوس کی گئی ہے کہ قارئین مصنف کے نقطہ نظر سے اچھی طرح واقف ہو جائیں اور اس کی روشنی میں اس تنقید سے فائدہ اٹھائیں جو میثاق کے آئندہ شمارے میں شائع کی جائے گی۔

خط کشیدہ عبارتوں کو مصنف نے خود ہی اپنے مضمون میں نمایاں کیا ہے۔

(ادارہ)

دوسرے ترقی پذیر ممالک کی طرح پاکستان بھی تعلیمی، معاشی اور اخلاقی وسائل کے مقابلے میں آبادی کے بڑھتے ہوئے سیلاب کے نازک مسئلے سے دوچار ہے اور اس بات کا عظیم خطرہ موجود ہے کہ اس بڑھتی ہوئی آبادی کے حملے کے سامنے یہ محدود وسائل ٹھہر نہ سکیں اور جنگ ہار جائیں جب تک ملک کی معاشی پیداوار بس اسی قدر ترقی کرتی رہے گی کہ افزائش آبادی سے پیدا ہونے والے مسائل سے بمشکل نبرد آزما ہو سکے تب تک ہمارے وسائل ایک ہاری ہوئی جنگ لڑ رہے ہوں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بین الاقوامی مسابقت کے میدان میں معاشی پیداوار اور افزائش آبادی کے درمیان اس سے بڑا فرق قائم رکھنا ضروری ہو گیا ہے جتنا فرق ہم آج قائم کرنے کے قابل ہوئے ہیں یا پھر اضافہ آبادی کی موجودہ شرح کے ہوتے ہوئے مستقبل قریب میں قائم کرنے کی سوچ سکتے ہیں۔ یہ صورت حال ایک نازک اخلاقی مسئلہ پیدا کرتی ہے۔ تحدید آبادی کا سوال

اُٹھایا جاتا ہے تو مختلف حلقوں کی طرف سے اعتراضات کی بوچھاڑ ہوتی ہے اور یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ اسلام خاندانی منصوبہ بندی اور تحدیدِ آبادی کے رواج کی کسی تحریک کے خلاف ہے۔ کبھی کبھی یہ نکتہ طرازی بھی کی جاتی ہے کہ افزائشِ آبادی کو روکنے کے بجائے ہمیں اُلٹا آبادی کو معاشی پیداوار میں اضافے کا ایک ذریعہ بنانا چاہیئے۔ یہ آخری متبادل تجویز تو ہم بعد میں زیرِ بحث لائیں گے، فی الحال ہمیں ان اعتراضات کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے جو مبنیہ طور پر خود اسلام کے اعتراضات ہیں۔

اوّل تو یہی بات تعجب انگیز ہے کہ جیسا کہ ہم اوپر کہہ چکے ہیں، ہم اپنی قوم کی مادی اور اخلاقی بہبود کی ترقی کے نازک ترین مسئلے سے دوچار ہوں اور اسلام اس کے آڑے آئے۔ کیونکہ اگر اسلام فی الواقع کسی لازمی اور حقیقی اخلاقی مطالبے کے پورا کرنے پر معترض ہوتا ہو تو پھر تو "خدانخواستہ" یہ ماننا پڑے گا کہ اسلام غیر اخلاقی ہے۔ تاہم مذکورہ اعتراضات کو زیرِ بحث لانا مناسب رہے گا تاکہ یہ متعین کیا جا سکے کہ وہ کسی واقعی اہمیت کے حامل بھی ہیں یا نہیں، اور اگر وہ ایسے ہوں تو ان کا مناسب لحاظ کیا جا سکے۔ جہاں تک قرآنِ حکیم کا تعلق ہے، اس کی آیات میں کہیں بھی یہ پابندی نہیں لگائی گئی ہے کہ ہم اپنے موجودہ مسائل کے حل کے طور پر ایک محدود عرصے تک تحدیدِ آبادی کی کوئی کوشش نہ کریں بلکہ قرآنِ مجید نے تحدیدِ آبادی کے مسئلے سے براہِ راست کوئی تعرض ہی نہیں کیا۔ قرآن میں ہمیں بس عام نوعیت کے بیانات ملتے ہیں مثلاً

"خدا نے تمہاری جنس سے تمہارا جوڑا بنایا اور پھر اس سے بیٹے اور پوتے پیدا کئے" (۱۶-آیت ۷۲)

یا مثلاً

"لوگو! اس خدا سے ڈرو جس نے تمہیں ایک ہی نفس سے پیدا کیا پھر اسی کی جنس سے اس کا جوڑا بنایا اور ان سے سب مرد اور عورتیں پھیلائیں" (۴-آیت ۱) وغیرہ۔

لیکن ان آیات میں، یا اسی طرح کی دوسری آیات میں کوئی ادنیٰ سا رجحان بھی ایسا معلوم نہیں ہوتا جس سے ہر طرح کے حالات میں لامحدود نسل کشی کا جواز ثابت ہو۔ بعض لوگ کبھی کبھی قرآنِ مجید کی اس آیت کا حوالہ دیتے ہیں۔

"زمین پر چلنے والا کوئی ذی روح ایسا نہیں جس کا رزق خدا کے ذمے نہ ہو" (۱۱-آیت ۶)

لیکن ان آیات سے معاشی وسائل کے لحاظ سے غیر متناسب اور لامحدود آبادی کے حق میں

استدلال ایک بچگانہ حرکت ہوگی۔ قرآن کا منشاء ہرگز یہ نہیں کہ ہر زندہ مخلوق کے لئے رزق مہیا کرنا اللہ کی ذمہ داری ہے خواہ وہ خود اپنے لئے قوت لایموت مہیا کرنے کے قابل ہو یا نہ ہو۔

تاہم اس بات کا سب سے بین ثبوت کہ قرآن و سُنت میں کوئی ایسی چیز موجود نہیں جو تحدید آبادی کے خلاف پڑتی ہو، یہ ہے کہ اس مسئلے پر خود فقہائے اسلام کے مابین قابلِ لحاظ اختلاف پایا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر امام غزالی کا نقطہ نظر یہ ہے کہ ضبط تولید کے عدم جواز کا کوئی ثبوت نہیں۔ وُہ کہتے ہیں کہ آدمی کا شادی نہ کرنا یا شادی کرنے کے بعد نسل نہ بڑھانا کم از کم مباح ضرور ہے۔ چنانچہ وہ ضبطِ تولید کو والدین کا، بلکہ محض والد کا مطلق حق قرار دیتے ہیں۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ فی نفسہٖ ضبطِ تولید تو ناجائز نہیں البتہ اس کے بعض محرکات ایسے ہو سکتے ہیں۔ مثلاً وہ کہتے ہیں کہ اگر والدین اپنے ہونے والے بچوں کی پرورش کے قابل نہ ہوں یا بیوی کے کمزور ہو جانے کا خطرہ ہو تب تو ضبطِ تولید میں کوئی حرج نہیں۔ ہاں اگر اس ڈر کے مارے کہ کہیں بچیاں پیدا نہ ہوں ضبطِ تولید کو عمل میں لایا جائے، جیسا کہ عرب جاہلیت کا تصور تھا، تب البتہ یہ قابلِ ملامت ہے کیونکہ یہ محرک غیر اخلاقی ہے۔ بعض حنفی فقہاء کا، جو بنیادی طور پر امام غزالی کے نقطہ نظر کے حامی ہیں، فتویٰ یہ ہے کہ جب تک میاں بیوی دونوں کی رضامندی موجود نہ ہو، ضبطِ تولید پر عمل نہ کیا جائے اور خاوند یا بیوی میں سے کسی ایک کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ بطورِ خود اسے عمل میں لائے۔

اس بیان سے یہ اچھی طرح واضح ہوتا ہے کہ ضبطِ تولید کے عدم جواز کے لئے شریعت میں قطعاً کوئی بنیاد نہیں۔ اگر قرآنِ حکیم یا سنتِ نبوی میں کوئی صریح نص ہوتی تو یہ فقہاء، جن کے موقف کا ہم جائزہ لے چکے ہیں، یقیناً اسے نظر انداز نہ کرتے البتہ فقہاء اور محققین کی اکثریت ایک اہم سبب سے ضبطِ تولید کی مخالفت پر آمادہ ہوئی ہے اور وہ یہ ہے کہ ان کے نزدیک بچے قوم یا ملت کا حقیقی سرمایہ ہیں اور انہیں اندیشہ ہے کہ کہیں لوگ اپنے نفسانی محرکات، مثلاً جنسی تسکین یا بچوں کی پرورش کے مصائب سے چھٹکارے کی خواہش کے زیرِ اثر اس انسانی سرمائے کے ضیاع کی طرف مائل نہ ہو جائیں اور اس طرح عظیم تر ملی مقاصد کے آڑے آئیں۔ یہ فی الواقع ایک قابلِ لحاظ پہلو ہے اور مجھے شبہ ہوتا ہے کہ تحدید آبادی کے خلاف اس ساری دلیل بازی کے پیچھے جس میں بظاہر قرآن و سُنت کی نصوص

کی پشت پناہی چاہی جاتی ہے، یہی فکر کام کر رہا ہے۔ ضبطِ تولید کے مخالف یہ گمان کرتے ہیں کہ اگر ایک مرتبہ قوم کم بچے پیدا کرنے کی عادی ہوگئی تو ضرورت پڑنے پر اسے زیادہ بچے پیدا کرنے پر آمادہ کرنا مشکل ہوگا کیونکہ لوگ دوبارہ اس بکھیڑے میں پڑنے پر آمادہ نہ ہوں گے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ اندیشہ حقیقی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایک تو اس بات کا کوئی بعید از قیاس امکان بھی موجود نہیں کہ ہم کبھی قلت آبادی کے مسئلہ سے دوچار ہوں گے، دوسرے اگر ایسے حالات پیدا ہو بھی جائیں تو ریاست کے لئے یہ کچھ مشکل نہ ہوگا کہ وہ ایسی پالیسی پر عملدرآمد کرے جس سے لوگوں کو بچے پیدا کرنے کی ترغیب ہو۔ چند دہائیاں پہلے فرانس بھی کچھ ایسی ہی صورتِ حال سے دوچار تھا لیکن آج وہ مناسب سرکاری پالیسیوں کی مدد سے خاندان بڑھانے کی روایت کو از سرِ نو رائج کرنے میں کامیاب ہوگیا ہے۔

مجھے یہ دہرانے میں کوئی باک نہیں کہ جس صورتِ حال سے ہم آج دوچار ہیں، اس کا سب سے اہم پہلو وہ اخلاقی مسئلہ ہے جو ملت کے مجموعی مفاد کے تقاضوں سے پیدا ہوتا ہے۔ یہاں ہم جمہور فقہاء کی اس رائے سے کامل اتفاق رکھتے ہیں کہ مسئلۂ آبادی کو والدین کے انفرادی مسئلے ہی کی حیثیت سے نہ لیا جائے بلکہ اسے ملت کے مجموعی مفاد سے متعلق کر کے اس پر غور کیا جائے۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا تو صحیح نہ ہوگا کہ انسانی جبلت کے بنیادی تقاضوں کو پابندیوں میں جکڑنا جائز اور روا ہے البتہ یہ صحیح ہے کہ اگر ہم ایک صالح اور تندرست معاشرے کا قیام چاہتے ہیں تو اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ قومی تقاضوں کے تحت فرد کے مطالبات کی تراش خراش کی جائے۔ اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ انجام کار قوم کا مفاد افراد کے مفاد ہی پر منتج ہوتا ہے۔

جمہور فقہاء، جن سے ہم اس اصول کی حد تک متفق ہیں کہ ملی مفادات کو درجۂ فوقیت حاصل ہے، ضبطِ تولید کے خلاف فتویٰ دینے پر آمادہ ہوئے تو اس کا سبب ان کی یہ رائے تھی کہ اگر مسلمانوں نے مناسب حد تک نسل بڑھانے سے ہاتھ اٹھا لیا تو اپنی عددی قلت کے سبب سے ملت بحیثیتِ مجموعی ایک عظیم خطرے سے دوچار ہوگی۔ بعینہٖ اسی اصول یعنی ملت کی قوت، عظمت اور اس کے تحفظ کی بنیاد پر ہم آج سراسر بدلے ہوئے حالات میں فقہاء کی رائے کے برعکس نتیجہ تک پہنچتے ہیں۔ ہمارے مسائل اب بدل چکے ہیں۔ آج ہمارا مسئلہ یہ

نہیں کہ ہماری تعداد کم ہے بلکہ یہ ہے کہ ہم معاشی بدحالی میں گرفتار ہیں، جسمانی لحاظ سے کمزور ہیں، عام طور پر ناکافی خوراک کے شکار اور مایوس کن حد تک کم تعلیم یافتہ ہیں۔ اس حقیر سرو سامان کے ساتھ ہمیں اس دنیا کا سامنا کرنا ہے جس میں ہر طرف جسمانی، اخلاقی اور ذہنی مسابقت کا دور دورہ ہے۔ ان حالات میں لازماً اسلام ہمارے لئے تحدید آبادی کو اس وقت تک کے لئے ضروری قرار دے گا جب تک ہم اپنے معیارِ زندگی کو مذکورہ ضروریات سے ہم آہنگ نہ کرلیں۔ یہ فعل یقیناً غیر اسلامی ہے کہ ہم بے تحاشا بچے پیدا کرتے چلے جائیں جن کے لئے مناسب غذا اور تعلیم کا ہم کوئی انتظام نہ کرسکیں۔ اور یقیناً نبی کریمؐ حشر کے روز ایک ایسی اُمت پر فخر نہ کرسکیں گے جو اگرچہ تعداد میں زیادہ ہو مگر نیم فلاکت زدہ لاچار، بیمار اور جاہل مردوں اور عورتوں پر مشتمل ہو۔ جس صورتِ حال سے ہم آج دوچار ہیں وہ تو اس کے برعکس ہم پر یہ اہم اسلامی فریضہ عائد کرتی ہے کہ آنے والی نسلوں کے لئے مادی اور اخلاقی دونوں اعتبار سے بہترین حالات پیدا کریں۔ نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) مفتوحہ ممالک کی زمین مسلمان فاتح فوج میں تقسیم کردیا کرتے تھے مگر خلیفہ ثانی حضرت عمرؓ نے عراق کی زمین اس بنا پر تقسیم کرنے سے انکار کردیا کہ اس طرح آئندہ نسلوں کا نقصان ہوگا۔ پھر اس امر کا قوی ثبوت موجود ہے کہ قرآنِ حکیم اور سنتِ نبوی مسلمانوں کے لئے یہ لازم کرتے ہیں کہ وہ قوی، صحتمند اور خوشحال ہوں تاکہ کرۂ ارضی پر حکومتِ الٰہیہ قائم کرنے کے قابل ہوسکیں۔ یہ فریضہ وہ قوم انجام نہیں دے سکتی جو افلاس، بیماری اور جہالت سے گھری ہوئی ہو۔

اب میں اس سوال کی طرف رجوع کرتا ہوں جو میں نے شروع میں اُٹھایا تھا یعنی کیا یہ ممکن نہیں کہ ضبطِ تولید کو بروئے کار لائے بغیر اس درجے کی معاشی خوشحالی پیدا کی جائے جو ہمارے قومی تقاضوں کو پورا کرسکے؟ جو لوگ اس طرز پر سوچتے ہیں انہیں یہ جان لینا چاہیئے کہ ایسا کرنا اگر ممکن ہے تو صرف اسی صورت میں جب نہ صرف معاشی ڈھانچے میں بلکہ پوری قوم کے زندگی کے متعلق نقطۂ نظر میں بھی انقلابی تبدیلیاں لائی جائیں۔ اگر ملک کے تمام وسائل قومی ملکیت قرار دے دیئے جائیں اور پوری قوم کو جبری محنت کے کیمپوں میں دھکیل دیا جائے جہاں بے کاری کی سزا سخت ہو اور اوقاتِ محنت طویل اور جبری ہوں، تو ممکن ہے کہ یہ خواب

شرمندۂ تعبیر ہو سکے۔ لیکن پھر بھی زیادہ سے زیادہ اس بات کا امکان ہی ہوگا کہ موجودہ حالات اور مطلوبہ نتائج کے درمیان حائل ہونے والی خلیج کسی قدر جلد پاٹی جا سکے۔ بلاشبہ یہ ایک بہت بڑا داؤ ہے مگر اس کی قیمت بہت بھاری ہے یعنی فرد کی آزادی کی قربانی حالانکہ اسلام میں فرد کی آزادی کو بڑی قدر و قیمت حاصل ہے۔ اس معاملے کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اگر ایسا جبری ماحول قائم کر دیا جائے تو لوگ سخت محنت کرنے پر مجبور ہونگے جس کے لازمی نتیجے کے طور پر آبادی میں اضافہ رک جائے گا کیونکہ طویل اوقات کی سخت محنت جنسی مشاغل میں کمی پیدا کر دے گی لہٰذا ہمیں ایسی شدید تبدیلی کی رائے دینے سے پہلے ہزار بار غور کرنا چاہیئے۔ اس کے بالمقابل افزائش نسل پر رضا کارانہ پابندیاں نہ غیر معمولی مصائب سے دوچار کرتی ہیں اور نہ غیر اخلاقی یا غیر اسلامی ہیں۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ، جیسا کہ ہم بیان کر آئے ہیں، موجودہ حالات میں ایسی پابندیاں عائد نہ کرنا سراسر غیر اخلاقی اور غیر اسلامی ہوگا۔ اگر فقہا کی وہ شہادت نہ بھی ہوتی جس کا ہم حوالہ دے آئے ہیں، تب بھی ہمارے لئے فقہاء نے "مصالح مرسلہ" جیسے بنیادی اور صحتمند اصول چھوڑے ہیں جن کی رو سے ملت کی اجتماعی بہبود کے مسائل کو اوّلیت دینا ضروری ہوتا ہے۔

البتہ منصوبہ بندی کرتے وقت ہمیں یہ متعین کرنا ہوگا کہ ہمارے معیار زندگی میں اضافے کی حدود کیا ہیں۔ مثال کے طور پر مغرب میں ایسے بہت سے لوگ موجود ہیں جو مسلسل محنت شاقہ کی کمائی سے ہر طرح کی اشیائے صرف کو بڑھانے اور جمع کرنے کی ایک لامتناہی جدوجہد میں مصروف رہتے ہیں۔ وہ ایک کار کے بعد دوسری کار اور ایک ٹیلیویژن سیٹ کے بعد دوسرا ٹیلیویژن سیٹ خرید لیں گے مگر دوسرا بچہ حاصل کرنے پر رضامند نہیں ہونگے۔ ہم یقیناً یہ نہیں چاہتے کہ ہمارے ہاں بھی ایسی صورت پیدا ہو لیکن بالفرض ایسے حالات پیدا بھی ہو جائیں تو مناسب قانونی یا انتظامی تدابیر سے ان کا بآسانی مداوا کیا جا سکے گا۔ بہر صورت مستقبل بعید تک ہمیں اس طرح کے حالات سے دوچار ہونے کا کوئی اندیشہ نہیں۔ البتہ اس بڑھتی ہوئی آبادی کے متعلق طرح طرح کے اندیشے لاحق ہیں جس کے لئے ایک معقول معیارِ زندگی مہیا کرنا ابھی سے بس سے باہر ہوتا چلا جا رہا ہے اور دوسری طرف ہماری آج کی دنیا کے تقاضے

(بقیہ مضمون صفحہ ۲۸ پر ملاحظہ ہو)

مقالات

جناب خالد مسعود صاحب

۵

جمع و ترتیب قرآن سے متعلق شیعی نقطہ نظر

عام خیال یہ ہے کہ جمع و ترتیب قرآن سے متعلق شیعہ حضرات کا نقطہ نظر اہل سنت کے نقطہ نظر سے بالکل مختلف ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس خیال کے لئے شیعی لٹریچر میں بنیاد موجود ہے لیکن جہاں تک ہمارا مطالعہ ہے اس کی روشنی میں ہم یہ رائے رکھتے ہیں کہ اس غلط بنیاد کے لئے تمام مواد ان کے غالی فرقوں اور متعصب اہل قلم نے فراہم کیا ہے، بالخصوص تحریف کا الزام تو تمام تر ان لوگوں کی ایجاد ہے جو غلو اور تعصب میں بالکل آخری حد تک پہنچ گئے تھے۔ ایسے لوگوں کی رایوں کے ذکر اور ان کی تردید سے چونکہ کوئی خاص فائدہ نہیں ہے اس وجہ سے ہم ان کو نظر انداز کرتے ہیں۔ ان لوگوں کی تردید کے لئے خود شیعوں کے اکابر علماء کی تصریحات کافی ہیں جن میں سے بعض اہم تصریحات مثال کے طور پر ہم یہاں نقل کرتے ہیں۔

شیعہ مذہب کے مشہور فقیہہ و محدث شیخ صدوق محمد بن علی بن بابویہ قمی (متوفی ۳۸۱ھ) اپنی کتاب "الاعتقادات" میں رقمطراز ہیں۔

"ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ جو قرآن اللہ تعالیٰ نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر اتارا، وہ بعینہٖ وہی قرآن ہے جو مابین الدفتین اُمت کے ہاتھوں میں موجود ہے۔ قرآن مجید اس سے زیادہ ایک حرف نہیں تھا۔ جو شخص ہماری طرف یہ منسوب کرتا ہے کہ ہم قرآن مجید

کے اس سے زیادہ ہونے کے قائل ہیں، وہ جھوٹا ہے۔"

شیعی متکلم وفقیہہ سید مرتضیٰ علی بن حسین بغدادی (متوفی ۴۴۶ھ) نے "الموضح عن وجہ اعجاز القرآن" میں تحریف قرآن کے لغو خیال کی پوری شدت کے ساتھ تردید کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"امامیہ اور حشویہ میں سے جن لوگوں نے اس بارہ میں اختلاف کیا ہے، ان کے اختلاف کی کوئی وقعت نہیں ہے۔ ان کے سارے اختلاف کا مدار اصحاب روایت کی چند ضعیف روایات پر ہے جن کو یہ حضرات صحیح سمجھتے ہیں، حالانکہ ان روایات کی یہ حیثیت نہیں ہے کہ ان کی بنیاد پر ایک ایسی بات سے انکار کر دیا جائے جس کی صحت قطعیت کیساتھ معلوم ہے۔"

شیخ الطائفہ ابو جعفر محمد بن حسن طوسی (متوفی ۴۶۰ھ) اپنی کتاب "التبیان فی علوم القرآن" میں لکھتے ہیں۔

"قرآن مجید کے متعلق کمی بیشی کی بات منہ سے نکالنا درست نہیں ہے۔ کیونکہ قرآن میں زیادتی کے باطل ہونے پر تو اجماع ہے اور کمی کے متعلق بھی عام مسلمانوں کا مذہب یہی ہے کہ کمی نہیں ہوئی۔ ہماری جماعت شیعہ کا بھی یہی عقیدہ اور صحیح مذہب ہے جس کو سید مرتضیٰ نے واضح دلائل سے ثابت کیا ہے اور یہی عقیدہ حضرات ائمہ کی روایات سے ظاہر ہوتا ہے۔"

اسی طرح کے اقوال دوسرے اکابر علمائے شیعہ مثلاً شیخ مفید محمد بن محمد بن نعمان بغدادی اور ابو علی فضل بن حسن طبرسی صاحب مجمع البیان کی کتابوں میں ملتے ہیں۔ دور حاضر کے علمائے شیعہ نے بھی عقیدہ تحریف قرآن سے براءت کا اظہار کیا ہے[1]۔ اس تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ تحریف قرآن کا عقیدہ شیعہ مذہب کا اصل عقیدہ نہیں ہے اور جو لوگ اسے مانتے ہیں وہ اپنی روایات سے ہٹ کر اسے مانتے ہیں۔

بعض لوگوں کا خیال یہ ہے کہ شیعہ حضرات قرآن کی موجودہ ترتیب کو الہامی نہیں سمجھتے اور یہ کہتے ہیں کہ خلفائے راشدین نے اپنی ذاتی پسند سے قرآن کی موجودہ طرز پر تالیف کی۔ اگرچہ اس

[1] مثال کے طور پر دیکھئے روح القرآن مصنفہ سید نجم الحسن کراروی ناظم اعلیٰ شیعہ مجلس علماء پاکستان۔

خیال کی بنیاد بھی شیعی لٹریچر میں موجود ہے مگر عقیدہ تحریف قرآن کی طرح اس کی تردید بھی اکابر علمائے شیعہ کے ہاں ملتی ہے۔ سید مرتضیٰ علی بن حسین جن کا حوالہ ہم اُوپر نقل کر آئے ہیں، کا قول یہ بھی ہے کہ

"عہد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں قرآن مجید اسی طرح مجموع و مولف تھا جس طرح اس وقت مجموع و مولف ہے۔ کیونکہ رسول کریم کے زمانہ میں قرآن کی تعلیم دی جاتی تھی اور اسے حفظ کیا جاتا تھا اور عبداللہ بن مسعودؓ، ابی بن کعبؓ اور دیگر صحابہؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کئی مرتبہ قرآن ختم کر کے سنایا۔"

علامہ محمد بن حسن الحر، جو امامیہ کے مشہور محدث ہیں، لکھتے ہیں:۔

"قرآن مجید کے بارے میں جو شخص بھی تفحص و تتبع کرے وہ اس بات کا یقین کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ قرآن مجید مکمل تواتر سے ثابت ہے۔ عہد رسولؐ میں ایک ہزار صحابہ نے اسے حفظ کیا تھا اور یہ اسی طرح مجموع و مولف رہا۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیعہ کے اسلاف کی تحریروں ہی میں ایسے شواہد مل جاتے ہیں جن سے ان اقوال کی تردید ہو جاتی ہے جو حفاظت قرآن کو مشکوک ٹھہراتے ہیں اور جن کو حقیقی شیعی عقیدہ کی تعبیر کے لئے پیش کیا جاتا ہے۔

بقیہ مضمون "پاکستان میں خاندانی منصوبہ بندی اور مذہب" صفحہ ۶۵ سے آگے

شدید تر ہوتے جا رہے ہیں۔ لیکن اگر ہمیں باقی رہنا ہے تو ان تقاضوں کو پورا کرنا ہوگا اور کون کہہ سکتا ہے کہ اسلام ہماری بقاء کا مخالف ہے؟

(م-ا)

تقریظ و تنقید

تاریخ دعوت و عزیمت (حصہ سوم)

تالیف : مولانا سید ابوالحسن علی ندوی
صفحات : ۳۱۲ - قیمت (مجلد) چھ روپے
شائع کردہ : مجلس تحقیقات و نشریات اسلام ندوۃ العلماء لکھنؤ (انڈیا)

"تاریخ دعوت و عزیمت" مولانا ابوالحسن علی کی وہ تصنیف ہے جس کی تکمیل کے لئے نہ معلوم کتنے مسلمان مدتوں سے چشم براہ ہیں۔ متعدد اکابر علماء اس سلسلہ کی افادیت کے قائل ہیں اور محترم مصنف کی محنت و بالغ نظری کو سراہ چکے ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ مصنف اپنی گوناگوں مصروفیتوں کے سبب سے اس سلسلہ کی تکمیل پر ابھی تک قادر نہیں ہو سکے۔ یہ جلد بھی جن حالات میں لکھی گئی ہے، ان کے پیدا ہونے میں دست غیب کی خاص کارفرمائی نظر آتی ہے۔ زیر نظر کتاب میں دو بزرگوں کے کارنامے بیان کئے گئے ہیں۔ ایک حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیری رحمۃ اللہ علیہ۔ ان کے علاوہ ضمناً خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ، خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ اور خواجہ فرید الدین گنج شکرؒ کا تذکرہ بھی آگیا ہے۔ مؤخر الذکر تینوں بزرگ ہندوستان میں چشتی سلسلہ تصوف کے بانیوں میں سے ہیں۔ غوری اور غلام خاندانوں کے عہد حکومت میں انہوں نے یہاں دعوت و ارشاد کی مسند آراستہ کی۔ اول الذکر دونوں بزرگوں کا زمانہ خلجی و تغلق عہد حکومت کا ہے۔ خواجہ اولیاءؒ نے اپنا مرکز دہلی میں بنایا لیکن شیخ منیریؒ کی خانقاہ بہار میں تھی۔ کتاب میں ان دونوں بزرگوں کی سوانح حیات، صفات و کمالات، تحقیقات و افادات اور فیوض و برکات کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ کتاب کے مقدمہ ہی میں فاضل مصنف نے یہ حقیقت بیان کر دی ہے کہ اہل تصوف کے بارے میں صحیح معلومات تک پہنچنا بے حد مشکل ہے کیونکہ اول تو ان کا تذکرہ بہت کم تاریخوں میں آیا ہے، دوسرے جو

کتابیں خاص طور پر ان کے متعلق لکھی گئی ہیں وہ بھی ان کی زندگی کے حالات سے کم لیکن کشف و کرامات کے عجیب و غریب واقعات سے زیادہ پر ہیں۔ زیر نظر تالیف کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں کرامات کو نظر انداز کر کے بحث کو سراسر علمی دائرے میں رکھا گیا ہے۔

ہماری رائے میں تاریخ دعوت و عزیمت کی یہ جلد سابقہ دو جلدوں سے بہت متفاوت ہے۔ ان جلدوں کی ترتیب اور طرز نگارش سے صاف طور پر یہ معلوم ہو جاتا تھا کہ مصنف کے منتخب اساطین اُمت نے کس ماحول میں آنکھیں کھولیں، اس وقت مسلمانوں کو کن مسائل کا سامنا تھا، ان بزرگوں نے حالات سے کیا اثر قبول کیا، ان کی زندگی کا لائحہ عمل کیا تھا اور ان کی کوششوں کے ثمرات کیا تھے؟ لیکن اس جلد کی ترتیب میں کئی اہم خلا چھوٹ گئے ہیں۔ جس کی وجہ شائد یہ ہے کہ ان شخصیتوں کے ساتھ فاضل مصنف کے قلبی تعلق اور روحانی نسبت نے ان سوالوں کو درخود اعتنا نہیں سمجھا۔ مثال کے طور پر کتاب کے مطالعہ کے بعد ہمیں یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ مذکورہ بزرگوں کو جس ماحول سے سابقہ پیش آیا۔ اس کے اجزائے ترکیبی کیا تھے؟ دعوت و تبلیغ کا کونسا طریق کار اپنایا گیا؟ مسلم و غیر مسلم آبادی کی نسبت سے دعوت اسلام میں کیا فرق ملحوظ رکھا گیا؟ اور سرزمین ہند پر ان کوششوں کے کیا نتائج مترتب ہوئے؟ مصنف محترم نے واقعات کی جو تصویر کھینچی ہے وہ بس اسی قدر ہے کہ یہ بزرگ اپنے اپنے مراکز پر مصروف عبادت رہتے تھے، لوگ آ آ کر ان کے ہاتھ پر بیعت کرتے اور ان کے ارشادات سے تحریراً و تقریراً مستفید ہوتے۔ نیز یہ کہ ان بزرگوں کے بعض منتسبین نے خانقاہیں بنا کر ان کے سلسلہ کو باقی رکھا۔ اس تصویر میں وہ پہلو غالب نہیں ہوئے جس کی طرف ہم نے اُوپر اشارہ کیا ہے۔ حالانکہ ہمارے نزدیک تاریخ دعوت و عزیمت کے باب میں کسی شخصیت کے انتخاب کے لئے ان پہلوؤں پر تفصیلی بحث نہایت ضروری ہے۔

خواجہ نظام الدین اولیاؒ اور شیخ شرف الدین منیریؒ دونوں ہندوستان کے اکابر صوفیہ میں سے ہیں ان کا طرز زندگی نہایت مثالی سمجھا جائے گا لیکن اس کتاب کے مطالعہ کے بعد ہمیں اس میں شریعت سے کسی قدر مغایرت نظر آئی ہے۔ مثلاً دونوں بزرگوں نے تجرید و تفرید کو بطور مقصد اپنایا، خواجہ نظام الدینؒ ساری زندگی مجرد رہے اور شیخ منیریؒ نے "نا پختگی" کے عالم میں جو نکاح کر لیا تھا، تصوف کو اختیار کرنے کے بعد اس سے کوئی سروکار نہیں رکھا۔ دونوں بزرگوں نے تعلق باللہ کی نشوونما

کے لئے شرعی طریق کار کے بجائے راہبانہ طریقہ اختیار کیا۔ ثانی الذکر بزرگ تو مدتوں بہیا اور راجگیر کے ان جنگلوں میں ریاضتیں کرتے رہے جو ہندو جوگیوں کے لئے گوشۂ عزلت کا کام دیتے تھے۔ علم باطنی کو دونوں بزرگوں کے ہاں "علم ظاہری" پر ترجیح دی جاتی رہی، اگرچہ وہ بقدر ضرورت اس کے اکتساب کے بھی قائل رہے۔

جہاں تک علم شریعت کی مرجوحیت کا تعلق ہے، فاضل مصنف کی اپنی تحریر بھی اسی نقطہ نظر کو نمایاں کرتی ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت خواجہ (نظام الدین اولیاؒ) کی کچھ کتابیں ابھی باقی تھیں، جذب و شوق کا تقاضا تھا کہ اب اس سلسلہ کو ختم کیا جائے اور علم حقیقی اور معرفت حقیقی کی تحصیل میں صرف کیا جائے جو پیدائش کا اصل مقصد اور یہاں کی حاضری کی غرض و غایت ہے۔ گویا سعدی کا یہ شعر حسب حال تھا ؎

سعدی بشوے لوح دل از نقش غیر دوست
علمے کہ رہ بحق نمایدجہالت است

تعلیم و تعلم کا طول طویل سلسلہ پہلے بھی قلب حساس اور روح بیدار پر بار تھا لیکن اس کو ایک ضرورت سمجھ کر اور اس لئے بھی کہ کوئی دوسرا راستہ سامنے نہ تھا اختیار کیا تھا اب جبکہ یقین کا سررشتہ اور علم حقیقی کا سرچشمہ مل گیا، اس سلسلہ دراز کا جاری رکھنا طبیعت پر سخت بار تھا۔"

(یاد رہے کہ یہ ساری تقریر علم دین کے بارے میں ہے جس کے اکتساب میں خواجہ اولیاؒ مصروف تھے)

دوسری جگہ لکھتے ہیں:۔

"اس محبت کا نتیجہ یہ تھا کہ دل میں محبوب کے سوا کسی کے خیال کی جگہ نہیں رہی تھی، کسی دوسری طرف توجہ بھی دل پر بار تھی ..... ایک مرتبہ فرمایا کہ اگر کبھی اتفاق سے میں ان کتابوں کا مطالعہ کرنے لگتا ہوں جو میں نے پڑھی ہیں تو طبیعت میں وحشت پیدا ہونے لگتی ہے اور اپنے دل میں کہتا ہوں کہ کہاں پڑ گیا؟"

مصنف ایسے بالغ النظر عالم کے قلم سے نکلے ہوئے یہ الفاظ تبصرہ نگار کے لئے بڑے اچنبھے کا باعث ہیں۔

بعض دوسرے مقامات پر کئی ایسے حقائق بیان کئے گئے ہیں جن کی منطق کم ازکم ہماری سمجھ میں نہیں آئی اور مصنف محترم نے بھی ان پر کوئی رد وقدح نہیں کی۔ مثال کے طور پر خواجہ نظام الدینؒ کا یہ ارشاد کہ سماع سے حضوری کی جو کیفیت پیدا ہوتی ہے اس کے لمحات بقیہ اوقات کو بھی اپنے دامن میں لے کر پاک اور نورانی بنا دیتے ہیں (حالانکہ اگر حقیقت یہی تھی تو تعجب ہے نبی اکرمؐ نے اسے مشروع کیوں نہ ٹھہرایا؟) یا خواجہ نصیر الدین چراغ دہلیؒ کا فیروز شاہ تغلق کو یہ الٹی میٹم کہ اگر تم نے عدل وانصاف سے حکومت نہ کی تو میں خدا سے دوسرا حکمران مانگ لوں گا۔ اور جب فیروز شاہ نے عدل وانصاف کرنے کا وعدہ کر لیا تو ان کا یہ فرمانا کہ میں نے تمہارے لئے خدا سے چالیس سال کی حکومت مانگ لی ہے یا یہ دعویٰ کہ خواجہ اولیاؒ کی بددعا کے نتیجہ میں شہر دہلی محمد تغلق کے ہاتھوں اس طرح تباہ ہو گیا کہ وہاں جنگلی درندوں کے سوا کوئی متنفس نظر نہ آتا تھا۔

تاہم یہ کتاب ہندوستان میں تصوف کی تاریخ سے واقف ہونے کے لئے بہت مفید ہے اس سلسلہ کے کئی اہم مباحث اس میں آگئے ہیں۔ کتاب کی لکھائی چھپائی نہایت عمدہ ہے۔

(خ۔م)

مکتبۂ میثاق ○ رحمانپورہ اچھرہ لاہور ۱۲

☆ آپ کو ہر کتب خانہ کی مطبوعہ ... اور علمی کتابیں فراہم کر سکتا ہے۔

☆ جب بھی آپکو کسی کتاب کی ضرورت ہو تو ایک پوسٹ کارڈ تحریر فرمائیے!

☆ بھارت کی کتابیں بھی دستیاب کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

☆ چھ روپے (۶/-) سے زائد قیمت کی کتابوں پر ڈاک خرچ معاف!

"منیجر"

محی الدین پرنٹر پبلشر نے نقوش پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر میثاق رحمانپورہ اچھرہ لاہور ۱۲ سے شائع کیا۔

Regd. No. L. 7360.

Monthly "MEESAAQ" Lahore.

MARCH - APRIL 1964

چند اہم مطبوعات

تصانیف مولانا آمین احسن اصلاحی

تدبر قران (قران فہمی کی رہنما)	3—25
تدبر قران (تفسیر آیہ بسم اللہ وسورہ فاتحہ)	0—75
اسلامی قانون کی تدوین	3—00 و 2—00
عائلی کمیشن رپورٹ پر تبصرہ	2—25
تزکیہ نفس	3—75

مطبوعات دیگر مصنفین

حضرت محمد ص	22—50
(آنحضرت ص) سیرت ابن ہشام	10—00
ابوبکر رض صدیق اکبر	10 - 00
عمر رض فاروق اعظم	20—00
حیات حضرت امام ابوحنیفہ رح	15—00
امام اعظم رح	4 - 00
حیات امام احمد بن حنبل رح	10—00
آثار امام شافعی رح	12—00
حیات امام مالک رح	10 - 00
حیات شیخ الاسلام ابن تیمیہ رح	21—00
تعبیر کی غلطی (جماعت اسلامی کا جائزہ)	6—00
زاد سفر (حصہ اول)	3—75
ISLAM & THE WORLD	4—00

مکتبہ میثاق (رحمان پورہ) اچھرہ - لاہور-12